

امتنہ ریاض

سنگی دو گنا

Hang-Ten سے نکلتے ہوئے میں اور نمل اچانک ایک دوسرے کے سامنے آگئے۔ چھ سال بعد ہونے والی یہ ملاقات اتنی غیر متوقع تھی کہ چند لمحے ہم صرف آنکھوں میں بے یقینی و خوشی کے رنگ سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے، پھر نمل بائیں پھیلا کر مجھ سے لپٹ گئی۔

”نور! مجھے یقین نہیں آ رہا، میں اتنے عرصے کے بعد تمہیں دیکھ رہی ہوں چھ سال۔“

وہ خوشی سے بھرپور آواز میں بے تکان بول رہی تھی۔ میں نے بھی اسے پیار سے خود سے لپٹا کر کہا۔

”او کسی قریبی کیفے میں بیٹھتے ہیں۔“

ہم دونوں ایک قریبی کیفے میں بیٹھ گئے۔ نمل

شادی کے بعد ہالینڈ چلی گئی تھی۔ اس نے بتایا اس تین بچے ہیں۔ بچوں کو اکیلا گھر چھوڑ کر آئی تھی لیے اسے جلدی گھر جانا تھا۔ اس نے کہا

”یہ تو بہت اچھا ہوا کہ تم سے یہاں ملاقات ہو میں بہت کم دنوں کے لیے پاکستان آئی ہوں۔ تم ایسا کسی کانڈریجھے اپنے گھر کا ایڈریس لکھ کر دو۔“

ان شاء اللہ پتلی فرصت میں تمہارے گھر کا چکر لگا دوں گا۔ ہاں سنو۔ ایڈریس کے ساتھ اپنا کانڈریجٹ بھی لکھ دیتا۔“

میں نے ایڈریس لکھ کر اسے پکڑا دیا۔

”اپنا کانڈریجٹ نمبر بھی دو مجھے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ کیوں نہیں۔“ اس نے چٹ پر نظر

مکمل ٹاؤل



ڈالتے ہوئے کہا۔
”ویسے نویر! تمہیں دیکھ کر لگ نہیں رہا کہ میں چھ سال بعد تمہیں دیکھ رہی ہوں بالکل ویسے کی ویسی ہو، پلیز یار! مجھے بھی تھوڑا سا وہ آبِ حیات دے دو جسے پی کر تم نے وقت کو خود پر روک لیا ہے۔“

”کم آن۔ تمہیں کیا ضرورت ہے وقت کو روکنے کی۔ لک ایٹ یوس۔ پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو گئی ہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے اس کے صبح چہرے پر نظریں ٹکا کر کہا۔

گوکہ وہ پہلے بھی خوب صورت تھی مگر اب اس کی خوب صورتی میں کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔ ہاں وہ تھوڑی مولی ضرور ہو گئی تھی۔ مگر اس چیز نے اس کی خوب صورتی کے تاثر کو کم نہیں کیا تھا۔

میری بات پر نمل نے ایک چھوٹا سا خوب صورت قہقہہ لگایا۔ ”اُمّ نہیں تو میرے موٹاپے کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ محترم فرماتے ہیں تین کے بجائے چھ بچوں کی اماں لگتی ہو۔“

”تمہاری تعریف نہیں کرتے؟“ میں نے اس کی بات کو غیر سنجیدگی سے لیتے ہوئے پوچھا۔

”ارے۔ تعریف کریں گے تو سر نہیں چڑھ جاؤں گی۔“ نمل نے سابقہ انداز میں کہا۔ ”ویسے بھی وہ صرف اپنی گرل فرینڈ کی تعریف کرتے ہیں۔“

میں اسی وقت اورنج جوس پی رہی تھی۔ مجھے پہلا ہی سبب اپنے حلق میں اٹکتا ہوا محسوس ہوا۔ نمل نے اپنی بات ختم نہیں کی تھی۔ وہ مستقل لاپرواہی سے بول رہی تھی۔

”اس بار جب میرا پاکستان آنے کا پلان بنا تو میں نے ان سے کہا، آپ بھی اس بار ہمارے ساتھ چلیں۔ ایکجو نیلی بچے انہیں یہاں آکر بہت مس کرتے ہیں تو میں نے کہا، آپ بھی چلیں، ایک مینے کی تو بات ہے، کہنے لگے ایک مینہ ہتھوڑ کے بغیر رہنا بہت مشکل ہے۔ اچھا ہے تم اور بچے پاکستان چلے جاؤ، میں اطمینان سے ہتھوڑ کے ساتھ یہ مینہ گزاروں گا، میں

نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔ ہتھوڑ از ریٹلی پری۔ اب اتنی خوب صورت گرل فرینڈ کو چھوڑ کر کوئی بیوی کے ساتھ چھٹیاں برباد کیوں کرے گا؟“

اس نے رائے مانگنے والے انداز میں میری طرف دیکھا۔ ایک بیوی کے منہ سے اس کے شوہر کی گرل فرینڈ کا نام سن کر ہی میں تو ہکا بکا رہ گئی تھی۔

”کیا ہوا؟ تم حیران ہو؟“ وہ میری شکل دیکھ کر ہنسی۔ ”یار! شوہروں کو تھوڑی Space دینا پڑتی ہے۔ ادھر ادھر منہ تو انہوں نے مارتا ہی ہوتا ہے تو پھر پابندی لگا کر اپنی زندگی کا سکون برباد کرنے کا کیا فائدہ؟ تمہیں یاد ہے۔ میں ہمیشہ کہا کرتی تھی مرد ہوتا ہی

بے وفا ہے۔ مجھے اس کے مزاج کا شادی سے پہلے ہی پتا تھا۔ تب ہی شادی کے اگلے روز ہی میں نے اس سے کہہ دیا تھا چاہے جتنی گرل فرینڈز رکھو بس تمہیں کچھ باتوں کا خیال رکھنا ہو گا۔ وہ اتنے خوش ہوئے اس بات پر۔ ”وہ بلا توقف بول رہی تھی۔“

”مجھے پتا تھا نویر! مرد کے خون میں وفا نہیں ہوتی۔ تمہیں یاد تو ہو گا، شادی سے پہلے میں آذر کے سامنے بھی یہ ہی کہا کرتی تھی کہ مرد جھوٹا اور بے وفا ہوتا ہے۔ میرے ڈرائیور کی مس کال ہے۔ وہ پارکنگ میں پہنچ گیا ہو گا۔“ وہ اپنے شاپنگ بیگز سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ تم اتنی فراخ دل ہو سکتی ہو کہ۔ کہ اپنے شوہر کو گرل فرینڈ رکھنے کی اجازت دو۔“

جواباً اس نے پھر چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔

”اسے فراخ دلی نہیں معاملہ فہمی کہتے ہیں۔ میں مرد کی فطرت سے آگاہ تھی۔ نویر! میرے باپ نے ماں کے ساتھ کیا کیا تھا؟ ماموں، ممانی کا گھر اسی جج جج کی وجہ سے ٹوٹ گیا۔ ان دونوں کے پاس آپشن تھا، وہ ان مردوں سے الگ ہو سکتی تھیں جنہوں نے ان سے

بے وفائی کی۔ مجھے اپنے شوہر کی بے وفائی پر اعتراض تب ہوتا جب وہ مجھے دھوکہ دیتا، اس نے تو شادی کے پہلے

ہی روز بتا دیا تھا۔ وہ ایک پراکتفا نہیں کر سکتا تو میں نے اسے خود اجازت دے دی۔ مجھے لگا اپنے سر پر سوکن کی تلوار لٹکانے سے بہتر ہے۔ میں اسے گرل فرینڈ رکھنے کی اجازت دے دوں اور دیکھ لو، اس ایک معاملے پر سیٹلمنٹ ہو جانے کے بعد ہم کتنی پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔“

”لیکن تم۔ تو آذر سے کتنی تھیں، میرا مطلب۔۔۔ کسی لڑکی پر دوسری نظر ڈالنے پر تم تو اسے قتل کرنے پر تل جاتی تھیں۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر تلخی سے ہنسی۔

”وہ اس لیے کہ اس وقت آذر میرا منگیترا تھا۔ شوہر کے ساتھ مصلحت سے کام لینا پڑتا ہے ورنہ رشتہ قائم نہیں رہ سکتا۔ مرد بے وفا ہوتا ہے۔ میں تو اس بات کو یونیورسل ٹرو تھ (آفاقی سچائی) مانتی ہوں۔ اگر کوئی یہ مانتا ہے کہ زمین گول ہے تو اسے یہ بھی مان لینا چاہیے کہ مرد بے وفا ہوتا ہے۔“

میں وہیں بیٹھی رہ گئی اور نمل اٹھ کر چلی گئی۔ میں نے گلاس وال سے اسے سڑک عبور کرتے اور پھر اس کار کی پچھلی سیٹ پر ایک شان کے عالم میں بیٹھتے دیکھا، جس کی ڈرائیونگ سیٹ کو ایک باوردی شو فر سنبھالے ہوئے تھا۔

پھر میری نظریں میز کے اس کونے کی طرف گئیں، جہاں کچھ دیر قبل نمل بیٹھی مرد کی فطرت پر روشنی ڈال رہی تھی۔ میں نے ہاتھ برسھا کر وہ چھوٹی سی چٹ اٹھالی جس پر میں نے ایڈریس لکھ کر دیا تھا۔ نمل وہ چٹ اٹھانا ”بھول“ گئی تھی۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے وہ مجھے اپنا کانٹیکٹ نمبر دینا ”بھول“ گئی تھی۔

اور بھول تو شاید میں بھی گئی تھی اس سے دوبارہ کانٹیکٹ نمبر مانگنا اور۔۔۔ اور اس چھوٹی سی چٹ پر اپنا درست ایڈریس اور کانٹیکٹ نمبر لکھنا۔ آپ جج سمجھے۔ اپنی بہترین دوست سے چھ سال بعد بیس منٹ کی مختصر ملاقات کے بعد میں اس سے دوبارہ نہیں ملنا چاہتی تھی۔

کیفے سے باہر آکر میں نے وہ چٹ پھاڑ کر ہوا کے سرود کی اور گھر آگئی۔ وہ دن اور آج کا دن ہے۔ میرے کانوں میں بار بار نمل کا فقرہ گونجنے لگتا ہے۔

”اگر کوئی یہ مانتا ہے کہ زمین گول ہے تو اسے یہ بھی مان لینا چاہیے کہ مرد بے وفا ہوتا ہے۔“

صرف یہ ہی نہیں مجھے رہ رہ کر وہ تمام واقعات یاد آرہے ہیں جنہیں بھول جانے کے باوجود اپنی زندگی سے نکال دینا میرے لیے ممکن نہیں۔

نمل سے ہونے والی اس ملاقات نے مجھے چھ سال پیچھے دھکیل دیا ہے۔ میں الجھ سی گئی۔

اچھا رکھیے۔ میں آپ کو پوری بات بتاتی ہوں، ممکن ہے آپ کسی نیچے پر پہنچنے میں میری مدد کر سکیں۔ میرے کانوں میں، تو واقعہ امار مار نمل، اکا۔ جملہ گور، بجر ما

ہے مگر میں فیصلہ نہیں کر پا رہی کہ۔۔۔
”کیا مرد واقعی بے وفا ہوتا ہے؟“

☆☆☆

وہ ایک دلکش شام تھی۔ جس وقت میں آفس سے نکلی، سرمئی بادلوں سے ڈھکا آسمان شریر جھک آیا تھا اور ہوا پھیلی پر خنکی اٹھائے سنہری تلی کی طرح اڑتی پھر رہی تھی۔

بلدیش۔ میری انہی کمزوری۔ مجھے یوں لگا جیسے دن بھر کی ٹھکن ریت کے ذروں کی طرح اس پھوار کے ساتھ بہہ رہی ہو، میں نے بازو پھیلا کر پھیل پر بارش کو سمیٹنا چاہا اور وہیں برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا کر نمل کا انتظار کرنے لگی۔ میں تقریباً ”ساڑھے تین“ سال سے اس بینک سے منسلک تھی اور آج کل بطور آپریشنل مینجنگ کام کر رہی تھی جبکہ نمل کی اپائنمنٹ چند مہینے کے ٹراکنل پر ہوئی تھی۔ میں چونکہ اس سے سینئر تھی، پھر وہ میری بہترین دوست بھی تھی اور سب سے بڑی بات آذر کے حوالے سے وہ میرے لیے بہت ہی خاص تھی۔ ان تین وجوہات کی بنا پر میں بطور خاص اس کا خیال رکھتی تھی۔

پھر وہ صبح سے کچھ پریشان لگ رہی تھی۔ لہجہ اور ز میں بھی اس سے بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا، اس لیے میں چاہتی تھی گھر جانے سے پہلے اس کی پریشانی کی وجہ معلوم کر لوں۔

”بارش۔۔۔“ مستقل برستی باریک پھوار بالکل ہی کن من میں بدل چکی تھی، جب میں نے اپنے عقب میں نمل کی آکٹائی ہوئی آواز سنی، وہ بے زاری کے ساتھ موسم کے تیور ملاحظہ کر رہی تھی۔

”کتنا اچھا موسم ہو رہا ہے نا؟ آج تو واک کرتے ہوئے گھر جانا چاہیے۔“ میں نے سرشاری کے عالم میں کہا، نمل کا منہ بن گیا۔

”یہ تم نہیں کہو گی تو کون کہے گا، تم جیسے لوگ جو اپنی Santro سے صرف موسم انجوائے کرنے کے لیے پاؤں باہر رکھتے ہیں، یہاں سے چلو گی تو ان سیدھی

سیدھی سڑکوں پر واک کرتی آرام سے گھر پہنچ جاؤ گی۔ مسئلہ تو ہم غریبوں کے لیے ہے۔ ان چند چھینٹوں کی بدولت گڑھی شاہو کی ان تنگ تنگ گلیوں میں گھنٹوں تک پانی کھڑا ہو گیا ہو گا۔“ میں کہہ کر پچھتائی۔

”اچھا آؤ۔۔۔ میں تمہیں ڈراپ کر دیتی ہوں۔“ ”رہنے دو۔۔۔ کہاں تمہارا گلبرگ فیر تھری، کہاں ہمارا گڑھی شاہو۔۔۔ میں لوکل سے چلی جاؤں گی۔“

”خبرے کرنا بند کرو نمل! یا میں گاڑے سے کہوں، تمہیں اٹھا کر گاڑی میں ڈال دے؟“ یہ دھمکی کارگر رہی، نمل چپ چاپ میرے ساتھ ہوئی۔

”میں تو کہتی ہوں ابھی گھر جانے کا خیال ہی دل سے نکال دو۔ بواجی نے ضرور کچھ مزے کی چیز پکائی ہو گی، میری طرف چلو، ڈنر کے بعد آٹھ بجے تک میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں گی۔“

گاڑی اشارت کرتے ہوئے میں نے اس کے خفا خفا چہرے پر نظر ڈالی۔

”اف بواجی کے ہاتھ کا کھانا، تم نے ابھی ضرور یاد کروانا تھا نویر! اب گھر جا کر وہ تلی دال کھانے کو کس کا دل چاہے گا۔“ اس نے بے ساختہ چٹخارہ لیتے ہوئے کہا۔ میں اس انداز پر ہنس دی۔

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں میری طرف چلو۔“

”رہنے دو یا ر! بس ذرا اسپید بڑھا کر جلد از جلد گھر پہنچا دو، ایسا نہ ہو جھڑکیوں کے ساتھ تلی دال بھی نہ ملے، گھر پہنچنے میں ذرا سی بھی تاخیر ہو گئی تو میری سوتیلی ماں نے چیخ چیخ کے آسمان سر پر اٹھالینا ہے اور ان کی دیکھا دیکھی سکے ابا نے مجھے ہی دنیا سے اٹھا دینا ہے۔“

وہ بظاہر ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی لیکن اس کی ہنسی میں جو تلخی تھی، میں اسے محسوس کر سکتی تھی۔ میرا دل حسب معمول دکھ سے بھر گیا۔

”کبھی کبھی میں سوچتی ہوں ابا کی بے وفائی اور رنگین مزاجی نے ماں کا بڑا فائدہ کر دیا۔ اس گھر میں رہتیں تو سوکھی روٹی کے ساتھ میٹھی آلو کا شور یا پتلی کالی دال کھانا پڑتی۔ اب فیصل آباد میں ماموں جان کے گھر مرغیاں بھون بھون کے کھاتی ہوں گی۔“

”تمہیں کیسے پتا؟“

”مجھے سب پتا ہے، مجھے سچے خواب آتے ہیں۔“ میں اس کی عادت سے واقف تھی۔ حد درجہ خود ترسی میں مبتلا ہونے کے باوجود اس کی حس مزاج ماند نہیں پڑی تھی۔

”دل جلانا بند کرو، یہ بتاؤ قلفی کھاؤ گی۔“ میں نے ایک سنگل پر گاڑی روکتے ہوئے پوچھا۔

”میرا دل کونکے کی طرح سلگ رہا ہے، ایک قلفی سے کیا ہو گا اس کا۔“ اس نے بے چارگی سے کہا۔

جواباً ”میں نے اسے گھور کر دیکھا۔“ ”اب پورا بھٹیلہ تو خرید کر دینے سے رہی۔“ میں نے اس کے لیے قلفی خرید کر اسے پکڑا دی اور گاڑی آگے بڑھائی۔

”البتہ آذر سے کہہ کر دیکھنا، وہ قلفی کا بھٹیلہ تو کیا قلفیوں کی پوری فیکٹری بھی خرید دے گا تمہیں۔“

”کتنا اچھا نہیں ہے تمہارا کزن۔ اسے بھی میرا دل جلانے سے فرصت ملے گی تو فیکٹری خرید کر دے گا۔“ نمل نے قلفی پر ایسے دانت گاڑے جیسے وہ قلفی نہیں آذر کی گردن ہو۔

”آذر سے پھر جھگڑا ہوا ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا، گوکہ پوچھنا نہیں چاہیے تھا، کیونکہ اس کی پریشانی اور میرے سوال کا جواب اس کے چہرے پر لٹھکتا تھا۔

”میں کیوں جھگڑا کروں گی، تمہیں پتا ہے میں کتنی پولاٹ ہوں۔“ میں نے مسکراہٹ چھپانے کے لیے گھڑکی طرف چہرہ موڑ لیا۔ آذر سے جھگڑا کرنے کے بعد نمل اکثر سیاسی لیڈروں جیسے بیانات دیا کرتی تھی۔

”اب کس بات پر ناراضی ہو گئی؟“

”میں کیوں ناراض ہوں گی؟ ویسے بھی ناراض اپنوں سے ہوا جاتا ہے، اریوں غیروں سے نہیں۔“ وہ نزوٹھے پن سے بولی اور اس بار میں اپنی ہنسی روک نہیں سکی۔

”اریے غیرے کی دی ہوئی انگوٹھی پہن کر پھرتی ہو، ناراض نہیں ہو سکتیں۔“

میں نے شرارت سے اسے دیکھا۔

”اس کی تو بات ہی مت کرو نویر! وہ بھی میرے ابا سے مختلف نہیں ہے۔ ویسا ہی بے وفا، دھوکہ باز اور فراڈ، میں تو کہتی ہوں تم کو بھی حسن پر نظر رکھنا چاہیے۔ مرو سے ایجوکیشنلی وفا کی امید ہی فضول ہے۔“

اس نے اپنا من پسند فقرہ تھوڑے سے ردوبدل سے دہرایا، مجھے برا لگا۔

”تم صرف اپنے ابا کی بات کرو، سب کے بارے میں ایسا کیسے کہہ سکتی ہو؟“ میں نے اپنی ناگواری چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے ٹوک دیا۔

”رائے قائم کرنے کے لیے ہمیشہ خود تجربہ نہیں کرنا پڑتا۔ دور جانے کی ضرورت نہیں، تم اپنے ارد گرد ہی دیکھ لو، کتنی ایسی خواتین ہیں جن کی زندگیاں مرو کی بے وفائی نے برباد کی۔ میری ماں، تمہاری بواجی، آذر کی اماں جان، کوئی ایک بھی ایسی عورت ہے ان میں جس کی زندگی کو تنہائیوں میں نہ جھونکا ہو مرد نے۔۔۔؟“

نمل کے پاس دلائل کی کمی نہ تھی۔ ”میرا نظریہ یہ تھا کہ تین چار افراد کے تلخ تجربے کو سامنے رکھتے ہوئے پوری میل کیشنگری کو بے وقایا دھوکہ باز قرار دینا کہاں کا انصاف ہے۔“

میں نے اپنے بابا کو دیکھا تھا جنہوں نے میری می کے ساتھ ایک بھرپور زندگی گزار دی تھی۔ میرے بھائی جو اپنی بیویوں سے پوری طرح مخلص تھے۔ پھر آذر تھا جو میرے حساب سے تو نمل کے ساتھ مخلص تھا۔ (یہ الگ بات کہ نمل کو اس کے اخلاص پر ہمیشہ شک رہا۔) اور سب سے بڑی حسن کی مثال تھی اس کی وفا پر شک کیا جا ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ شخص سترہ سال سے میرے ساتھ وفا نبھا رہا تھا۔

”پلیز نمل! حسن کا نام تو تم ان مردوں کے ساتھ مت لیا کرو۔ مجھے اس پر خود سے زیادہ بھروسہ ہے۔ اور آذر بے چارے نے کیا وفائی کی ہے تمہارے ساتھ؟“ ”مگنی سے پہلے جتنے وعدے کیے ان میں سے ایک بھی پورا نہیں کیا۔ کیا اس دھوکہ دہی کو بے وفائی نہیں

کہتے ہیں؟ اس نے سلگ کر پوچھا۔ مجھے ہنسی آگئی۔
”نمل! خدا را پہیلیاں بچھوانے کے بجائے تم مجھے واضح لفظوں میں بتا دو، اس بار تم دونوں کا جھگڑا کس بات پر ہوا ہے۔“

نمل چند لمحے خاموشی سے باہر دیکھتی رہی۔
”آذر اسکاٹ لینڈ کے لیے اپلائی کر رہا ہے تاکہ وہاں سے Culinary Art میں بیچلرز کر سکے۔“ بالاخر ملی تھیلے سے باہر آگئی۔

”پھر؟“ میں نے پوچھا۔
”پھر؟“ وہ بری طرح چڑ گئی۔

”کم آن نویر! آذر تمہارا کزن ہے تو اسے جسٹھی فائے کرنے کی کوشش مت کرنا، دنیا ترقی کر رہی ہے لوگ آگے بڑھنے کے راستے ڈھونڈ رہے ہیں اور یہ محترم باورچی بننے کی تیاریوں میں ہیں، سی اے اے اسی لیے کیا تھا تاکہ کل کو کسی ڈھابے پر ”چھوٹے“ کی نوکری کر سکے؟“

نمل دل کی بری نہیں تھی، لیکن زبان کی بے حد کڑوی تھی، خصوصاً جب اس کی جذباتیت پر حملہ ہوتا تو وہ بھول جاتی تھی کہ اس کی زبان تیز دھار تلوار کی طرح دوسروں کے دل پر چر کے لگا سکتی ہے۔ یکایک میں آذر کے لیے فکر مند ہونے لگی۔

”آذر ہمیشہ اپنے لیے سوچتا ہے، اسے میری اور میرے خوابوں کی کوئی پروا نہیں۔ میں بہت پریشان ہوں نویر! اگر آذر کی ضد کی یہی صورت حال رہی تو۔۔۔ تو شاید ہم ایک ساتھ نہ چل سکیں۔“ اس بار وہ قدرے نمل سے بول رہی تھی۔

”کم آن نمل!“ میں نے فوراً اسے ٹوک دیا۔
”میں آذر کو سمجھاؤں گی، لیکن پلیز یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے کہ تم لوگ اپنے راستے ہی الگ کرنے کا سوچنا شروع کرو، آذر! Culinary art (پکانے کے فن) میں کچھ کرنا چاہ رہا ہے تو کرنے دو، بڑا پرانا شوق ہے یہ اس کا اور پھر وہ کون سا اسے پروفیشن بنائے گا اور سچی بات ہے اگر پروفیشن بنانے کا سوچے بھی تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اتنی پر اپنی ہے اس کی، اگر

ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر گھر میں بیٹھا رہے، تب بھی مزے سے زندگی گزر سکتی ہے اس کی۔“
”اوہ پلیز۔۔۔ اب یہ بات تم آذر کے سامنے نہ کہہ دینا، اسے پہلے ہی بڑا مان ہے اپنے صاحب جائیداد ہونے پر، تب ہی پیسہ برباد کرنے کے لیے اسکاٹ لینڈ جانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ بہر حال تم اسے بتا دینا جو بھی کرنا ہو سوچ سمجھ کر کرے، میں کسی باورچی سے شادی نہیں کروں گی۔“ اس نے حتمی انداز میں کہہ کر بات ہی ختم کر دی تھی۔



نمل کو ڈراپ کر کے میں نے واپسی کا قصد کیا تو آسمان پر بادل نا صرف بہت گہرے ہو چکے تھے بلکہ گرج بھی رہے تھے اور بجلی بھی چمکنے لگی تھی۔ میں نے اسپید برہادی لیکن اس سے پہلے بواجی کو تاخیر سے واپسی کی اطلاع دینا نہیں بھولی۔

”نویر! تم ایسا کرو گھر جانے کے بجائے آذر کی طرف ہی آ جاؤ۔ یہ لڑکا زبردستی مجھے اٹھا کر لے آیا ہے کہ بیسن کی روٹی بنا کر کھلائیں۔ اب تم بھی ادھر ہی آ جاؤ اور سنو گاڑی احتیاط سے چلا نا۔“

بواجی نے تاکید کر کے فون بند کر دیا۔ میں مطمئن ہو گئی کیونکہ آذر سے نمل کے سلسلے میں تو بات کرنا ہی تھی۔ آذر اور نمل کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑے بڑے جھگڑے کرنے کی عادت تھی اور میں چونکہ ان دونوں کی دوست ہونے کے باوجود عمر کے اعتبار سے ان کی جی تھی، اس لیے ان کے جھگڑوں میں ثالث کا کردار ادا کرنا پڑتا تھا۔

آذر میری امی کی خالہ زاد بہن کا بیٹا تھا۔ بارہ سال کی عمر تک وہ ٹیکساس میں رہا۔ اس کے بعد کسی معمولی بات کو بنیاد بنا کر آذر کے والد نے شارقہ خالہ کو طلاق دے دی۔ شارقہ خالہ کے پاس چونکہ نیشنل کالج تھی، اس لیے ان کو فوراً پاکستان آنا پڑا مگر جب ان کی کفالت کی بات آئی تو فیصلہ آذر پر چھوڑ دیا گیا تاکہ وہ اور باپ میں سے جس کے ساتھ چاہے وہ سلسلے

دار نے شارقہ خالہ کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔ جب شارقہ خالہ اور آذر پاکستان آئے تو میری امی نے حق کی ادا کرتے ہوئے شارقہ خالہ کا بہت ساتھ دیا۔

مجھے یاد ہے ابتدا کے دو تین سال تو خالہ اور آذر امارت گھر میں ہی رہے پھر خالہ نے اپنا زیور بیچ کر امارت گھر کے قریب ہی ایک چھوٹا مگر خوب صورت اکل انٹوری مکان خرید لیا۔

بہت عرصہ بعد آذر کے والد کی اس سے ناراضی ختم ہوئی۔ انہوں نے آذر کی طرف سے شارقہ خالہ کے ساتھ رہنے کے فیصلے پر اختیار کر رکھی تھی تو انہوں نے پاکستان میں موجود اپنی ساری پر اپنی آذر کے نام

آذر، اسی اسکول میں داخل کروایا گیا جہاں میں بھی تھی۔ اسکول میں اس کا چھوٹے بھائیوں کی زبان پر تھی لیکن آذر غضب کا ذہین بچہ تھا۔ پہلے ان کے تین سال اسے ڈبل کے بجائے ٹریپل پر موشن ملا اور ان کے تین سال چھوٹا ہونے کے باوجود وہ میرا کلاس فیلو تھا۔ ان تینوں میں سے ہماری دوستی کی شروعات ہوئی

ایڈمیشن تک ہم اکٹھے پڑھتے رہے، پھر میں نے ایڈمیشن میں ایڈمیشن لے لیا، جبکہ آذر جاپان کے لیے رخت سفر باندھنے لگا۔ وہ جاپان جا کر Culinary Art سے متعلقہ کوئی ڈگری پڑھنا چاہتا تھا۔ سب حیران تھے، اچھا بھلا کام رس کی پڑھنا پڑھتے ہوئے اسے پروفیشنل شیف بننے کا خیال نہ آیا۔ صرف میں اور شارقہ خالہ تھے جو اس کے دل سے واقف تھے۔ کوکنگ میں وہ پہلے ہی بہت سی پروفیشنل انسٹی ٹیوٹ سے ٹریننگ لیے بغیر ایڈمیشن اٹالین اور کانٹی نینٹل ڈشز بنانے میں دلچسپی لیتا تھا۔ دنیا بھر کے ڈیزرٹ اسے بنانا آتے تھے۔

ان دنوں یاریسٹورنٹ میں جاتے، کچھ دیر بعد وہ نائب ہو جاتا اور ہمیشہ ہی وہاں کے کچن میں رہتا تھا۔ بہت ساری ڈشز کی تراکیب اس نے ان دنوں پھرتے پھرتے حاصل کی تھیں۔ کبھی ایسا

ہوتا کہ کوئی ترکیب ریسٹورنٹ والے کسی قیمت پر بتانے پر راضی نہ ہوتے، ایسے میں آذر گھر آکر اس ڈش پر تب تک محنت کرتا جب ریسٹورنٹ جیسا ڈانقہ نہ بن جاتا۔

اپنے شوق کو بالا خر اس نے پروفیشن بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ان ہی دنوں نیڈو نے اپنی پروڈکٹس کی پروموشن کے سلسلے میں ورکشاپ کا اہتمام کیا۔ آذر نے بھی اس ورکشاپ میں شرکت کی اور جب واپس آیا تو انیڈل بڑی بڑی آنکھوں اور بے حد گوری رنگت والی نمل کے پاس چھوڑ آیا تھا اور ہاتھ میں ایک پمفلٹ تھا جس پر نمل کا ایڈریس لکھا ہوا تھا جو آذر نے جانے کن دفتروں سے حاصل کیا تھا۔

اب آذر صاحب نے محبت کی رسم مذہبی فریضہ سمجھ کر ادا کی اور مطمئن ہو گئے۔ مصیبت میں آگئی میری جان، کیونکہ وہ میں ہی تھی جسے آذر کی جذباتی دھمکیوں سے متاثر ہو کر نمل کو اس سے ملوانے کا بندوبست کرنا تھا۔ اور یہ کام میں نے کن دفتروں سے کیا، یہ ایک الگ ہی داستان ہے، مگر سچی بات ہے نمل سے دوستی کر کے اس کے گھر تک پہنچنے میں مجھے دانتوں پسینہ آگیا تھا۔

نمل غریب گھرانے کی خوب صورت لڑکی تھی، اس کی زندگی میں دو ایسے غضب ڈھارہے تھے، ایک اس کے باپ کی ماں سے بے وفائی، دوسرے حد سے بڑھی ہوئی غرور، سوتیلی ماں کی گالیاں اور آدھے درجن سوتیلے بہن، بھائیوں کی چیخ چیخ زلی ایسے شمار کیے جاسکتے تھے۔

بہر حال ان تمام چیزوں نے مل کر نمل کے مزاج میں تلخی بھری تھی۔

نمل اور آذر تو خیر محبت کی ڈور میں بندھ گئے، آذر مجھ سے تین سال چھوٹا تھا تو نمل پانچ سال چھوٹی تھی، عمروں کے فرق کے باوجود ہم تینوں کی دوستی مضبوط سے مضبوط ترین ہوتی چلی گئی۔ دوستی کے ان کئی سالوں کے دوران جہاں آذر نے اپنی عادت و مزاج کو

نمل کی مرضی کے مطابق ڈھالا وہیں نمل کے مزاج کی تلخی بتدریج کم ہوتی رہی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس نے اپنی رائے میں رد و بدل کرنا سیکھ لیا تھا، بلکہ اپنی بات پر ڈٹے رہنے کی عادت میں تو مزید شدت آگئی تھی۔

دروازہ آذر نے کھولا اور کھولتے ہی مجھ پر برسے لگا۔
”انسان میں تھوڑا صبر ہونا چاہیے نور آپا! یہ نہیں کہ گھنٹی پر ہاتھ رکھا اور بھول گئے۔“
کچن آپرین باندھے، ٹی شرٹ کی آستین کہنیوں تک فولڈ کیے وہ سخت جھنجھایا ہوا لگ رہا تھا۔ میں سمجھ گئی، آپ اس کے کام میں خلل ڈالنے کی کچھ سزا تو مجھے ملنا ہی تھی، لیکن اپنے نام کے ساتھ آپا کا لفظ سن کر میں چڑ گئی۔

”تم اگر اپنی سستی کو ایک طرف رکھ کر دروازہ جلدی کھول دیا کرو تو میں گھنٹی پر ہاتھ رکھ کر کبھی نہ بھولوں اور اب تم نے دوبارہ مجھے آپا کہا تو میں تمہارے دانت توڑ دوں گی۔“

”اب خود سے اتنی بڑی کزن کو آپا بھی نہ کہوں تو کیا کہوں؟ نہ بھی نہ میری اماں نے بچپن سے سکھایا ہے کہ بڑوں کو ادب احترام سے مخاطب کرنا چاہیے۔“
اس نے بن کر کہا، میں نے غصے کے اظہار کے طور پر دوبارہ گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیا۔

”آپ نارام دیکھا ہے تم نے؟ میں بواجی سے تمہاری شکایت لگاتا ہوں، یہ کوئی وقت ہے گھر آنے کا۔“ وہ دروازہ بند کر کے میرے پیچھے ہی چلا آیا۔
”تمہاری منگیتر کو اس کے گھر چھوڑنے چلی گئی تھی اور میری۔۔۔“

میری بات سننے بغیر ہی آذر کچن کی طرف چلا گیا۔
ایک لمحے مجھے احساس ہوا معاملہ سنگین تھا۔ ورنہ آذر اور نمل کا نام آتے ہی اتنی سنجیدگی کا مظاہرہ کرے، ممکن ہی نہیں۔

میں شارقہ خالہ کے کمرے میں آگئی، بواجی بھی

وہیں تھیں، میں ان دونوں سے حال احوال دریافت کرنے لگی۔ چند منٹ بعد میں کچن میں آگئی۔ کچن خوشبوؤں سے بھرا ہوا تھا اور کھڑکی سے لان میں برستی بارش دکھائی دے رہی تھی۔

”کچھ کھانے کو ملے گا؟“ میں نے فریج میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”خنگ دودھ کا حلہ ہے، کھانا چاہو تو مائیکرو ویو میں گرم کر لو۔“ آذر نے چائنگ بورڈ پر سبزیاں کاٹتے ہوئے مصروفیت بھرے انداز میں جواب دیا۔ میں نے فریج سے حلہ برآمد کر کے مائیکرو ویو میں رکھا اور ٹائم سیٹ کر کے آذر کے پھرتی سے سبزیاں کاٹتے ہاتھ دیکھنے لگی۔

”ویسے ایک بات تو ہے، تم سے شادی کے بعد نمل کے تو مزے ہو جائیں گے۔“ میں مائیکرو ویو سے پلیٹ نکال کر کچن ٹیبل پر آ بیٹھی اور رشک بھرے انداز میں کہا۔

”ہر روز نہ سہی، لیکن ہفتے میں ایک بار تو تمہارے ہاتھ کا بے حد لذیذ کھانا تو ضرور ہی کھانے کو ملا کرے گا۔“

”ہاں۔۔۔ اور تو مجھے کوئی کام ہوگا نہیں، محترمہ کے لیے کھانا بنا رہا ہوں گا۔“ آذر نے جل کر کہا۔

”آذر! اس بار جھگڑے کا ایجنڈا کیا ہے؟“ میں نے پوچھ ہی لیا۔ آذر کی عادت سے میں واقف تھی، بنا پوچھے وہ اصل بات کبھی نہ اگلتا، ہاں پہیلیاں ضرور جھجھاتا رہتا۔

”تم نمل کو گھر چھوڑ کر آرہی ہو، اس نے نہیں بتایا؟“ اس کا انداز طنزیہ ہو گیا تھا۔

”کم آن آذر! تم دونوں بچوں کی طرح کب تک جھگڑتے رہو گے۔ جھگڑا کرنے کے بعد تم دونوں ایک دوسرے سے بات کرنا بھی چھوڑ دیتے ہو۔ تم دونوں ایک دوسرے کا پوائنٹ آف ویو سمجھنے کی کوشش تو کرو۔“

”تم یہ ساری باتیں اپنی سہیلی کو سمجھاؤ۔“ اس نے سرعت سے میری بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

”اس محبت کو نبھانے کے لیے آج تک نمل نے کیا کیا ہے، ہمیشہ میں ہی اپنے خیالات بدلتا رہا۔ اپنی ترجیحات، اپنی خواہشات کو پس پشت ڈالتا رہا اور اس کے بدلے میں مجھے کیا ملتا ہے؟ نمل صاحبہ ہر بار معمولی سی بات کو بنیاد بنا کر میری ساری محنت پر پانی پھیر دیتی ہیں، تم مانو گی نور، اس لڑکی کو آج تک یقین نہیں آیا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ محبت اور کیسے کی جاتی ہے؟ تمہیں یاد ہے میں نے گریجویشن میں ہی ڈیپائڈ کر لیا تھا کہ میں پروفیشنل شیف بنوں گا، لیکن پھر مجھے نمل مل گئی، اس نے کہا۔ ”شیف کا کوئی کیریئر نہیں ہوتا، کوئی انکم نہیں ہوتی، مجھ سے محبت کرتے ہو، مجھ سے شادی کرنی ہے تو کوئی ایسی ڈگری لو جس سے مجھے تمہارا فیوچر سیکور (محفوظ) نظر آئے۔“

تو صرف نمل کی خواہش پوری کرنے کے لیے میں نے سی۔ اے کیا۔ تمہیں بتا ہی ہے نور! مجھے سی اے میں کوئی انٹرسٹ نہیں تھا۔ کتنی دقتوں سے ڈگری کھلیٹ کی میں نے کیوں؟ صرف نمل کی خوشی کے لیے اور صرف نمل کی خوشی کے لیے ہی پچھلے چھ سالوں سے اس ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کر رہا ہوں، لیکن نمل کسی طرح خوش ہی نہیں ہوتی، کسی طرح مطمئن نہیں ہوتی، آج سے نو سال پہلے میں جاپان جانا چاہتا تھا تو وہاں کے کوئنگ آرٹ اسکول میں مجھے اسکالر شپ مل رہا تھا، جسے میں نے صرف اور صرف نمل کے لیے ڈراپ کر دیا۔ اب اگر میں وہاں ایڈمیشن کے لیے جاؤں تو مجھے گیٹ بھی کراس کرنے نہیں دیا جائے گا، کیونکہ میں اور اتج ہو چکا ہوں، میں نے نمل سے کہا، چلو شادی کر لیتے ہیں، مگر اس کی وہ ہی رٹ کیریئر بنالیں، روپیہ جمع کر لیں، شادی کرنی تو فیملی میں پڑ جائیں گے اور فیملی صرف محبت سے نہیں روپے پیسوں سے نبھائی جاتی ہے۔ میں نے کہا، میں اتنا کماسکتا ہوں کہ اسے اور اپنے بچوں کو ایک بہترین مستقبل دے سکوں، لیکن نمل کے پتا نہیں کون سے تحفظات ہیں۔

کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے وہ شادی ہی نہیں کرنا چاہتی، ٹر خاری ہے مجھے۔“ وہ جیسے پھٹ پڑا تھا۔

”ایسے مت سوچو آذر! محبت تو نمل بھی کرتی ہے تم سے۔“ میں نے فوراً کہا۔

”ایسے کی جاتی ہے محبت؟“ وہ ترخ کرولا۔ ”میں محض اس کی خاطر اپنی خواہشات سے دستبردار ہو گیا اور اتنے سالوں کے بعد بھی وہ مجھے میری چھوٹی سی خواہش پوری نہیں کرنے دینا چاہتی۔“

”بتایا نا تمہیں، جاپان کے کوئنگ اسکول میں تو مجھے اسکالر شپ مل رہا تھا۔ اب جب نمل نے کہا کہ شادی کے لیے دو تین سال مزید رک جائیں تو میں نے سوچا اس دوران اپنا شوق پورا کر لیتا ہوں، میں نے آفس سے ایک سال کی چھٹی کے لیے درخواست دی اور اسکات لینڈ کے Chaffey college (شیف کالج) میں ایڈمیشن کے لیے اپلائی کر دیا۔ نمل کا خیال ہے میں یہ جو ٹریننگ کورس کے لیے جا رہا ہوں تو وقت اور پیسے دونوں ضائع کر رہا ہوں، وہ یہ نہیں سوچتی، شیف ٹریننگ لینا میرا کتنا بڑا شوق ہے۔“

”تم یہ ہی بات اسے پیار سے بٹھا کر بھی تو سمجھا سکتے ہو، جھگڑنا ضروری ہے؟“ میں نے نمل سے کہا۔
”پچھلے کئی سالوں سے یہ ہی کوشش کر رہا ہوں۔“ وہ پھر جل کرولا۔

”لیکن پیار سے کسی بات اس کی سمجھ میں ہی نہیں آتی، وہ اس لیے کیونکہ اس کے اپنے دل میں میرے لیے پیار محبت جیسی کوئی چیز نہیں ہے، میں ہی احمق، بواجی ہوں جو گدھوں کی طرح اتنے سالوں سے اس سے محبت کیے جا رہا ہوں۔“

”خدارا۔۔۔ آذر! اس طرح مت سوچو، تم جانتے ہو نمل ہمیشہ سے ایسی ہی ہے، اسے کبھی بھی اس کے ماں باپ۔۔۔ خصوصاً باپ سے محبت نہیں ملی، نہ ہی توجہ، پھر انہوں نے نمل کی امی کو اس وقت چھوڑ دیا جب نمل بہت چھوٹی تھی، اسی لیے اسے کسی پر بھی یقین نہیں رہا۔ اب جب تم سے محبت ملتی ہے تو وہ

شاید بد اعتمادی کا شکار ہو جاتی ہے اور چاہتی ہے، تم وہ ہی سب کرو جو اسے ٹھیک لگے۔ شاید اس طرح۔۔۔“ میری بات پھر بیچ میں رہ گئی، کیونکہ آذر نے میری بات کا شادی تھی۔

”مجھے اپنے اشیاء پر چلا کروہ اپنی انا کی تسکین چاہتی ہے۔“ آذر تلخی سے ہنسا۔ ”اپنی سہیلی کو بتا دینا نور! میں اس کی تسکین کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ جب اسے مجھ سے محبت ہی نہیں ہے، اس نے مجھ سے شادی ہی نہیں کرنی تو میں کیوں اس کے ہاتھوں میں کھ پتلی بنارہوں، میں نے سوچ لیا ہے، میں اب اپنی زندگی کو اپنی مرضی سے گزاروں گا، نمل کی مرضی سے نہیں، اس لیے میں کل ہی ریزائن کر کے اسکاٹ لینڈ جانے کی تیاری کر رہا ہوں۔ وہاں جا کر میں شیف ٹریننگ لوں گا اور واپس آکر اپنا ذاتی انٹرنیشنل لیول کا ہوٹل بناؤں گا جہاں دنیا کا بہترین Cuisine (پکوان) سرو کیا جائے گا۔ تم دیکھنا نور! ایک دن میں دنیا کا بہترین شیف بنوں گا، منو چندرا کو بھی پیچھے چھوڑ دوں گا، میری تصویر چھ ماہ تک بزنس ٹوڈے کے ٹائٹل پر لگتی رہے گی اور تمہاری نمل میری تصویر دیکھ کر آپس بھرا کرے گی۔“

بے حد پر عزم انداز میں اپنے مستقبل کے متعلق پیش گوئی کرتے ہوئے وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔

”اور ہاں۔۔۔ میں تو تمہیں بھی بتا رہا ہوں، دنیا کے بہترین شیف سے آٹو گراف لینا ہو تو ابھی لے لو، کیونکہ آج سے چند سال بعد جب میں مشہور ہو جاؤں گا تو ممکن ہے مغرور ہو جاؤں اور اگر میں مغرور ہو گیا تو تم جیسے دوستوں کو آٹو گراف دینا تو دور کی بات ہے۔ تمہاری طرف دیکھوں گا بھی نہیں۔“

سنجیدگی کے عقب سے چھانکتی شرارت جس کی چغلی اس کی آنکھیں کر رہی تھیں۔ اس سے قبل کہ ہماری بحث طول پکڑتی۔ شارقہ خالہ کچن میں آکر آذر سے کھانے کے متعلق پوچھنے لگیں۔

دونوں ہی اپنی ضد سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھے، نہ ہی دونوں یہ سمجھ پارہے تھے کہ محبت سے بڑی ضد تو

اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔

تقریباً ”دس بجے کے قریب ہم نے کھانا کھایا جو کہ حسب معمول بہت اچھا تھا۔ میرے اور اپنے لیے اس نے ساسوجز کامبو بنایا تھا اور اس کا اصرار تھا۔ میں تسلیم کروں میں نے آج تک ایسا بہترین ساسوجز کامبو نہیں کھایا۔ میں کیوں مانتی جبکہ میں خود اس سے بہترین بنا سکتی تھی۔“

”اوہ نہ۔۔۔ کبھی اندھ تو ڈھنگ سے ابلا نہیں ہوگا“ دعو کر رہی ہیں ساسوجز کامبو بنانے کا۔ ”چونکہ شارقہ خالہ بھی میرے ہاتھ کے ذائقے کی تعریف کر چکی تھیں۔ اس لیے آذر جل کر خاک ہو گیا، اسی نوک جھونک میں گیارہ بج گئے اور نمل کے ایس ایم ایس آنے لگے۔ اسے بجس تھا کیا میں آذر کو اس کا فیصلہ سنا چکی ہوں یا نہیں۔“

میں متذبذب، کسے پہلے کس کا فیصلہ سناؤں، آذر کو نمل کا یا نمل کو آذر کا اور سمجھاؤں بھی تو کس کو؟ ”آذر! میرے ساتھ لان میں چلو، مجھے بات کرنی ہے۔“ میں نے بزرگ خواتین سے نظر بچا کر آذر سے کہا، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور وہیں اپنا لیپ ٹاپ آن کر کے بیٹھ گیا۔

”تم میری بات کیوں نہیں سن رہے آذر۔“ مجھے غصہ آگیا۔

”کوئی عقل والی بات ہو تو سنوں۔“ ”چلیے بواجی! بہت دیر ہو گئی ہے، گھر چلتے ہیں۔ میں نے ناراضی کے طور پر فوراً ”بواجی“ سے کہا۔ ”بھئی بھئیے بواجی! میں ذرا ایک ای میل کر لوں، آپ لوگوں کو چھوڑ آؤں گا۔“ اور تم چپ چاپ بیٹھ رہو۔“ آذر نے کہا۔

”اب بس بھی کرو۔ کیا بچوں کی طرح جھگڑ رہے ہو۔“ شارقہ خالہ نے ہم دونوں کو ڈپٹا تو آذر فوراً ”بوللا“ ”بے ناامی! حالانکہ نور آتا تو مجھ سے عمر میں بڑی ہیں، ان کو تو مجھ سے نہیں جھگڑنا چاہیے۔“ ”خالہ جان! اپنے بیٹے کو سمجھالیں، اب اگر آذر نے مجھے آپا کہا تو میں بہت بری طرح پیش آؤں گی

یہ ہمارا بڑا پرانا جھگڑا تھا۔ آذر ہمیشہ مجھے کیا کہہ کر چڑاتا تھا۔ میری بات سن کر شارقہ خالہ، آذر کو ڈانٹنے لگیں، وہ خاموش تو ہو گیا، لیکن وقتاً فوقتاً شرارتی سی نظریں مجھ پر ڈال لیتا تھا۔

شارقہ خالہ مجھ سے حسن کے متعلق پوچھنے لگیں۔
”پہلے تو اس کا پاکستان آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے خالہ۔“

”آج آذر نے بیسنی روٹی بنانے کی بات کی تو مجھے حسن یاد آگیا، وہ بہت شوق سے کھایا کرتا تھا اب اپنوں سے اتنی دور بیٹھا ہے یہ شوق بھی یاد ہو گا کہ نہیں۔ پتا ہے آپ! صبح سے میرا دل بوجھل سا تھا، آذر پہلے بھی کتنا رہا کہ بواجی کے پاس ہو آئیں، پھر شام میں جا کر آپ کو لے آیا اور وہ اچھا ہی ہوا، اسی بہانے نور کو بھی خالہ سے ملنے کا خیال آگیا، ورنہ یہ تو ہمارے گھر کا رستہ ہی بھول گئی ہے۔“ شارقہ خالہ نے ایک ساتھ ہم دونوں سے باتیں کر ڈالیں۔

”سال کے آخری دن چل رہے ہیں نا خالہ! تو بس۔ آئیں میں کام بھی اسی حساب سے ہے، یقین مانیں اتنی مصروفیت ہے کہ کھانا بھی وقت پر کھانے کی فرصت نہیں مل پاری۔“
”ہاں تو کیا ضرورت ہے خود کو اتنا تھکانے کی۔“ شارقہ خالہ نے کہا۔

”حسن سے کہو واپس آئے اور تم دونوں شادی کر کے اپنا گھر بار سنبھالو، میں پوچھتی ہوں، کب کرو گے شادی۔ جب جسم میں جان ہی نہ ہوگی۔“
”میں تو خود اسے یہ ہی سمجھاتی ہوں۔“ بواجی نے بھی کہنا شروع کیا۔

”آخر کب تک اس طرح زندگی گزارتے رہنا ہے۔ اس کے ساتھ کی لڑکیاں اب تک دو، دو، تین تین بچوں کی مائیں بن چکی ہیں اور اسے نوکری سے ہی فرصت نہیں۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا حسن اور یہ سوچے کیا بیٹھے ہیں۔“

”آپ کو حسن اور نور کی سمجھ نہیں آتی، میرے

دلغ میں آذر اور نمل کے خیالات نہیں بیٹھے۔ لوجی یہ بھی کوئی بات ہوئی، جب تک اسٹیبلشمنٹ نہیں ہو جاتے، شادی نہیں کرنی، کوئی ان سے پوچھے اور کتنا اسٹیبلشمنٹ ہونا ہے، نوکری دونوں کر رہے ہیں، کمار ہے ہیں، اپنی مرضی کا پھر سب سے بڑی بات یہ کہ آذر نے کون سا نمل کی کمائی کھائی ہے۔ میں اپنے بیٹے کو جانتی ہوں، شادی کے بعد نمل کمائی بھی رہی تو وہ اس کے پیسے کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ مگر۔ بس اللہ ہی جھے این بچوں کو۔“ شارقہ خالہ بے زاری سے کہہ رہی تھیں۔

”کیا یہ بہتر نہیں ہوگا، آپ خواتین ہم پر غور و خوض فرمانا بند کر دیں۔“ آذر نے کہا اور اٹھ کر بچن کی طرف چلا گیا۔ شارقہ خالہ بواجی سے آذر کی شکایت کرنے لگیں، جب آذر واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک تھوڑا سا دیکھ کر مسکرایا۔

”چلو اب تم فنٹ فلمی ہیروئینوں کی طرح دیکھ کر شادی کر دو، کیو امالی گاؤ، آج میرا برتھ ڈے ہے میں تو بھول ہی گئی تھی۔“

مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی، کیونکہ میں اپنی سالگرہ کا دن کبھی نہیں بھولتی تھی اور آذر ہر سال مجھے اور نمل کو خوش کرنے کا کوئی نیا طریقہ ڈھونڈ لیتا تھا۔ آج کاؤز بھی اسی لیے ارج کیا گیا تھا، تاکہ عین بارہ بجے مجھے خوش کر سکے۔ پھر آذر نے باقاعدہ جنگل گا کر مجھے دس کیا، جبکہ شارقہ خالہ اور بواجی نے مجھے گلے لگا کر ڈھیروں دعائیں دی تھیں اور جب کیک کاٹنے کی باری آئی تو آذر نے مجھ سے پوچھا۔

”کیک تو میں نے بیک کر لیا تھا، لیکن فیصلہ نہیں کر پایا اس پر موم بتیاں کتنی لگائی جائیں؟“
میں اس کی شرارت سمجھ رہی تھی، اس لیے خا ہوئے بنا مسکراتی رہی۔

”موم بتیاں لگانا ضروری ہے کیا؟ ایسے ہی کیک کاٹ لو۔“ شارقہ خالہ نے کہا۔

”خالہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ویسے بھی 33 بتیاں کہاں سے لاؤ گے تم۔“ میں نے مسکرا

ہوئے کہا۔ جی ہاں آپ ٹھیک سمجھے، یہ میری زندگی کے تہمتیسویں سال کا آغاز تھا۔

”تھینک یو سوچ آذر! یو آر جی اگڈ فرینڈ آف مائین (تم میرے بہترین دوست ہو۔) تم ہمیشہ یاد رکھتے ہو اور میں اتنی بری ہوں کہ ہر بار تمہارا برتھ ڈے بھول جاتی ہوں، لیکن میرا وعدہ ہے اس سال ضرور یاد رکھوں گی۔“ چھری ہاتھ میں لیتے ہوئے میں نے کہا۔
جواباً آذر لا پرواہی سے بولا۔

”برتھ ڈے بے شک یاد نہ رکھنا، بس میرا ایک کام کرو۔“
”کون سا کام؟“

وہ ذرا سا جھجکا اور بزرگ خواتین سے نظر ہچا کر مسکین سی شکل بنا کر بولا۔
”نمل سے میری صلح کرادو۔ اس کے خیالات سے منت اختلاف کے باوجود میں اس کے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔“

آواز دیا کر اس نے بے چارگی سے کہا تھا اور میری ایسی چھوٹ گئی تھی۔

”نور! آج یہ ڈاکیہ دے گیا تھا۔“ گھر آکر بواجی نے ہلکے لفافے مجھے پکڑا دیے۔ ان لفافوں کو کھولے بغیر اسی میں جانتی تھی، حسن نے بھجوائے ہیں۔ وہ ہر سال میری سالگرہ سے پہلے مجھے کارڈز بھجواتا تھا اور ایک خاص دس معاہدے کے تحت میں انہیں سالگرہ والے روز ہی کھولتی۔ میں نے لفافوں کو لے کر پر جوش انداز میں الٹ پلٹ کر دیکھا، حسن کی ہر چیز میرے لیے قیمتی اور عزیز تھی۔

”میں اپنے لیے کافی بنانے لگی ہوں بواجی! آپ کے لیے دودھ گرم کر دوں۔“ میں نے بواجی سے پوچھا، ان وہ منع کر کے سونے چلی گئیں۔ وہ تہجد گزار ہیں۔ رات کو بھی جلدی سونے کی عادی، لیکن آذر نے اپنے سر پر ان کے چکر میں ان کی بھی نیند خراب کرادی۔

میں اپنے لیے کافی بنا کر کمرے میں آگئی، لیکن اس سے پہلے اپنے کمرے میں موجود ٹیلی فون کی ایکسٹینشن کو لینڈ لائن سے جوڑنا نہیں بھولی تھی۔ میرے موبائل فون پر تقریباً ”سب ہی فرینڈز اور کولیگز کے Greeting Messages آچکے تھے۔ بھائی اور بہنوں کے بچوں کے بھی میسجز۔ آرہے تھے۔ اسجد، اصفاء اور سجاد نے تو سالگرہ کی مبارک کے ساتھ ہی ٹریٹ کا مطالبہ بھی کر دیا تھا۔ میں جانتی تھی صبح ہوتے ہی ان سب کی فون کالز بھی آنا شروع ہو جائیں گی، اتنی ڈھیر ساری محبتوں کے احساس سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سچ تو یہ ہے کہ خود مختار زندگی گزارنے کے باوجود میرا دامن محبتوں اور چاہتوں سے خوب مالا مال تھا۔

سارے ایس ایم ایس چیک کرنے اور سب کو فردا فردا ”شکریہ ادا کرنے کے بعد میں نے حسن کا پہلا کارڈ اٹھایا، یہ تھا کہ فون کی بیل بجنے لگی۔

میں نے جھپٹ کر ریسیور اٹھایا، لیکن حسن کے بجائے ماریہ بھابی کی آواز سن کر مجھے تھوڑی سی مایوسی ہوئی تھی۔

”میں نے سوچا، میں اپنی منہ صاحبہ کو دس ہی کر دوں، بھی تمہیں میری عادت کا تو پتا ہے بولتی میں سچ ہوں، تینتیس سال کی عمر میں تو لڑکیاں اپنے بچوں کی سالگرہ منا رہی ہوتی ہیں، لیکن تمہاری تو نہ اچھی شادی ہوئی، نہ بچے ہیں، اپنی سالگرہ نہیں مناؤ گی تو کس کی مناؤ گی۔ لیکن میرے مشورے کو اپنی سالگرہ کا تحفہ ہی سمجھ لو، بس حسن سے کہو واپس آئے اور آکر گھر بسائے۔ تینتیس سال کم عمر نہیں ہوتی نور! تمہیں دس کرنے کے لیے عفی اللارم لگا کر سوتی تھی، لیکن اس عمر کی نیند کا تو تمہیں پتا ہے۔ کس قدر بچی ہوئی ہے۔ اللارم بچن بچ کر بند ہو گیا، لیکن عفی کی آنکھ نہ کھلی، میں نے سوچا، میں ہی فون کر لوں، ویسے بھی آج کل میں اور تمہارے بھائی جان تمہارے لیے بہت پریشان ہیں۔ عفی کے لیے بڑا اچھا رشتہ آیا ہوا ہے، لڑکے کی فیصل آباد میں اپنی فیجوک مل ہیں۔ تمہارے بھائی تو

چاہ رہے تھے منگنی کر دیں۔ مگر تم خود سوچو، جس کی پھوپھی ابھی بن بیابھی بیٹھی ہے اس کی منگنی کا ہم کیسے سوچ لیں۔“

ماریہ بھابھی کی ساری دل دکھانے والی باتیں ایک طرف اور یہ آخری بات ایک طرف میں کوشش کے باوجود اپنی ناگواری چھپا نہیں پائی۔

”آپ میری وجہ سے غمی کے رشتے کو انکار مت کریں بھابھی! اگر رشتہ اچھا ہے تو ہاں کر دیں۔“

”ارے پاگل سمجھ لیا ہے کیا ہمیں۔ معاشرے میں رہنا ہے ہم نے۔ پھوپھی سے پہلے بیٹی کا رشتہ کر کے دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے۔“

”آپ دنیا کی پروا نہ کریں۔“ میں نے کہا۔

”تمہارے لیے کہنا آسان ہے کیونکہ تم نے کبھی پروا نہیں کی۔ ہمارے لیے تو سوچنا بھی محال آج سے چند سال پہلے دنیا کی کم باتیں سنیں ہیں ہم نے کہ بھائی کا گھر ہوتے ہوئے جوان جہان بہن الگ گھر میں رہ رہی ہے۔ اب کسی کو کیا پتا بہن کا اپنا ہی گزارہ نہیں ہوتا تھا۔“ ماریہ بھابھی نے حسب عادت مجھے جلی کٹی سنا کر فون بند کر دیا اور میرا دل بری طرح جو جھل ہو گیا۔ پچھلے کئی سالوں سے ماریہ بھابھی کی ایسی باتیں سننے کے باوجود نہ جانے میں عادی کیوں نہیں ہو پائی تھی۔

ماریہ بھابھی میرے بڑے بھائی فاروق غوری کی بیوی تھیں۔ بڑے بھائی کی حیثیت سے فاروق بھائی نے ہم چھوٹے بہن بھائیوں کو بہت شفقت سے نوازا تھا۔ وہ بہت بہترین شخصیت کے مالک تھے، بے حد نرم گو اور معاملہ فہم انسان تھے۔ ماریہ بھابھی مزاج میں ان کے بالکل برعکس تھیں۔ لہجہ طنزیہ ہوتا اور نرم انداز گفتگو تو اتنی عمر گزارنے کے باوجود انہیں نہ آسکا تھا۔ مجھ سے تو انہیں خصوصی پر خاش تھی، آج سے کچھ سال پہلے جب میں نے الگ گھر لے کر رہنے کا فیصلہ کیا تو اس کے پیچھے بھی ماریہ بھابھی کا ناروا رویہ تھا اور میرے اس اقدام کو اب تک بھابھی میری ہٹ دھرمی گردانتی تھیں۔

میں ماریہ بھابھی کی باتوں پر کڑھ رہی تھی کہ فون کی

بیل پھر بجنے لگی اور اس بار دوسری طرف حسن ہی تھا۔ ”کیا بات ہے، کچھ پریشان لگ رہی ہو؟“ میری آواز سنتے ہی اس نے کہا اور میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ محبت کیسا طاقتور جذبہ ہے جو بنا کے ایک دل کی کیفیت دوسرے دل پر اتار دیتا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی حسن نے کہا۔

”مگر پریشان بھی ہو تو خوش ہو جاؤ، کیونکہ میرے پاس ایک خوش خبری ہے، میں پاکستان آ رہا ہوں۔“ خوشی کے بے پایاں احساس نے جیسے مجھے گنگ سی کر دیا تھا، میں کچھ بول ہی نہیں سکی۔

میں نے کہیں پڑھا تھا۔ ”محبت کو اپنے وجود کی پروا خست کے لیے کسی وجہ کے عنصر کی ضرورت نہیں ہوتی۔“

اگر میں حسن کی محبت میں مبتلا نہ ہوتی تو یقیناً فوراً اس بات کو رد کر دیتی۔ حسن سے میری محبت کسی وجہ کی محتاج نہیں تھی۔ محبت ہمارے رشتے کی سب سے بڑی سچائی اور خوب صورتی تھی۔ میں نہیں جانتی پہلے پہل وہ مجھے کب اچھا لگا یا میرے دل میں اس کی محبت کی کوئیل نے کب سر اٹھایا۔ میں ہمیشہ سے اس سے ملتی رہی تھی وہ ہمیشہ سے ہمارے گھر آتا جاتا تھا۔ حسن میرے چچا کا بیٹا اور چار بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ وہ ہمارے ساتھ نہیں رہا، لیکن ہم بچوں کا بہت دور وقت اکٹھے کھیلتے کودتے، شرارتیں کرتے گزرتا تھا۔ مدثر چچا کے مالی حالات کبھی اچھے نہیں رہے۔ میں اپنے بابا اور دونوں پھوپھیوں کو ہمیشہ ان کے لیے پریشانی کا اظہار کرتے دیکھا تھا۔ مدثر چچا کو جواں عمر میں ایک روڈ ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں اپنی ٹانگ کم پڑی۔ یہ جسمانی کمزوری ساری زندگی ان کے حالات پر اثر انداز ہوتی رہی۔ میرے بابا نے ہمیشہ کوشش کی کہ کسی طرح مدثر چچا ان سے مالی مدد کے لیے تیار ہو جائیں، لیکن مدثر چچا کی خود ارطبیعت نے یہ منظور نہ کیا۔ وہ کرشن نگر میں ایک چھوٹا سا

لے کر رہتے رہے، لیکن کبھی بہن، بھائیوں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلا یا۔

چچا جان کے انتقال کے بعد یہی وتیرہ چچی جان نے اپنا یا۔ حسن اس وقت چھوٹا تھا اور بہنیں اتنی پڑھی لکھی نہیں تھیں کہ گھر سے باہر جا کر کوئی ملازمت کر سکتیں۔ بابا جان نے بڑی منتوں سے چچی جان کو مالی مدد لینے کے لیے راضی کیا تھا۔ حسن اکلوتا ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے گھر میں سب سے چھوٹا بھی تھا۔ بابا جان نے چچی جان کی مرضی سے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا اور اس کی پڑھائی کا خاص خیال رکھنے لگے۔

حسن مجھ سے عمر میں تین سال بڑا تھا مگر اتنا بڑا بھی نہیں تھا کہ ہر وقت بڑے ابا کی طرح ری ایکٹ کرتا۔ وہ جب بھی ہمارے گھر آتا، کتابوں میں سر دیے بیٹھا رہتا۔ میں اور میری چھوٹی بہن فلک ہمیشہ اس کو تنگ کرتے یا بابا جان کے سامنے اس کی سنجیدگی کا مذاق اڑاتے اور بابا جان سے ڈانٹ کھاتے۔

”حسن بہت قابل بچہ ہے۔ بہت ترقی کرے گا۔“ بابا جان اکثر کہتے۔

مجھے اس کے روشن مستقبل پر کوئی شک نہیں تھا۔ بس میں یہ چاہتی تھی وہ اتنا سنجیدہ اور الگ تھلگ نہ رہا کرے۔ جب میں آڈر اور فلک کھیل رہے ہوتے وہ آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھا کرتا یا می جان کے پاس ہاتھ میں چلا جاتا اور ان کی مدد کرواتا۔

فلک کا خیال تھا، حسن قابل بچہ تو ہے یا نہیں۔ ہالاک ضرور ہے اور بہنوں کے سامنے اچھا امپریشن بنا کر رکھتا ہے تاکہ جب ہم اس کے سڑیل پن کی کاکیت کسی بڑے سے کریں تو وہ یقین ہی نہ کرے۔ مجھے فلک کی بات پر یقین تھا۔ لیکن میں نے کبھی اس بات پر غور ہی نہیں کیا کہ کھیل کے دوران ہم سب سے الگ تھلگ رہنے والا حسن ہر بار ہمارے گھر آتے اور میرے لیے پسندیدہ چاکلیٹ کیوں لاتا تھا۔ کئی بار فلک نے اس سے شکوہ بھی کیا کہ حسن اس کے لیے چاکلیٹ کیوں نہیں لاتا۔ حسن اس کے شکوے کو ہنس کر ٹال دیتا۔

ایسا، ایس، سی کے ایگزام سے فارغ ہوتے ہی حسن نے لیسیا جانے کا فیصلہ سنا دیا۔ ایک ایجنٹ کے ذریعے اسے لیب اسٹنٹ کا ویزا مل رہا تھا۔ حسن یہ موقع ہاتھ سے گنوا نا نہیں چاہتا تھا۔ بابا جان کے علاوہ فاروق بھائی اور معظم بھائی نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ لیب اسٹنٹ کا ویزا ترقی کا کوئی ایسا خاص دروازہ نہیں تھا جس کے کھلنے کی آس میں انسان گھر بار چھوڑنے کا ارادہ کرے۔ ان ہی دنوں حسن کی بڑی بہن منیہ کا رشتہ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا اور اس کی وجہ ان کی کمزور مالی حالت بتائی گئی تھی۔ حسن کے دل کو اس بات نے ٹھیس پہنچائی تھی۔ بابا جان کے سمجھانے پر اس نے اپنی پٹاری سے یہ ہی وجہ نکال کر ان کے سامنے رکھ دی۔

”آپ کے پہلے ہی مجھ پر اور میرے گھر انے پر بہت احسانات ہیں تایا ابو! لیکن اب اور میں نہیں چاہتا میں اپنی بہنوں کو ایک بہتر مستقبل دینا چاہتا ہوں۔ آج سے چند سال بعد بھی تو بڑھ لکھ کر مجھے ملازمت ہی کرنا ہے تو پھر میں ابھی سے کوشش کیوں نہ کروں۔ ٹھیک ہے میں مانتا ہوں لیب اسٹنٹ کی جاب کوئی خاص نہیں ہے، لیکن ایک بار میں لیسیا چلا جاؤں، کچھ عرصہ لیب میں کام کرنے کے بعد کوئی بہتر ملازمت تلاش کر لوں گا۔ میری جگہ ابو ہوتے تو وہ بھی یہی کرتے۔“ حسن فیصلہ تو کر ہی چکا تھا، اب روکنے یا سمجھانے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ بابا جان خاموشی سے ایک طرف ہو گئے اور یوں حسن لیسیا چلا گیا۔

رواگئی سے قبل وہ ہمارے گھر آیا۔ سب سے مل کر جس وقت وہ واپس جا رہا تھا۔ میں لان میں کتابیں لیے بیٹھی تھی۔ گیٹ کی طرف جانے کے بجائے وہ میرے پاس آ گیا۔

”میں کل جا رہا ہوں۔“

میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ انیس سال کا سنجیدہ مزاج حسن اپنی آنکھوں میں جھجک لیے میری طرف بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کے عقب میں چمکتی ہوئی دھوپ تھی اور ایک پل کے لیے بھی اس نے میرے

چہرے سے نظریں نہیں ہٹائی تھیں۔

”مجھے پتا ہے۔ دس یوگنڈ لک۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

حسن خاموشی سے کھڑا میری طرف دیکھتا رہا۔ کرسی کی پشت پر رکھے اس کے ہاتھ اضطراری انداز میں ہل رہے تھے۔ مجھے اس کی نظروں سے ابھرنے ہونے لگی۔ وہ مستقل خاموشی سے مجھے دیکھ رہا تھا اور سولہ سال کی عمر میں محبت کے جذبے کو محسوس کیے بنا میرے لیے اس کی آنکھوں میں لکھی تحریر کو پڑھنا تقریباً ناممکن تھا۔

محبت نہ ہو تو بات الگ ہوتی ہے، لیکن محبت ہو تو دیکھنے، سوچنے، سمجھنے کا انداز بدل جاتا ہے۔ اگر آپ نے محبت کی ہو تو آپ کو اس کا اندازہ بخوبی ہوگا۔ بہر حال حسن کی خاموشی کو میں نے اس کی اداسی پر محمول کیا اور اسے تسلی دینے لگی۔

”تم پریشان کیوں ہو رہے ہو؟ دیکھنا تم اپنے سارے ارادوں میں کامیاب ہو جاؤ گے، منیجر ہوا اور مائدہ آپا کی شادیاں ہوں گی، تمہیں بہتر جاب مل جائے گی، پھر تم واپس آ جانا اور پاکستان میں کوئی کاروبار کر لینا۔ اکثر لوگ ایسا کرتے ہیں۔ میں تمہارے لیے دعا کروں گی۔“

”تو میرے“ اس نے میری بات قطع کر دی۔ ”مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے؟“ مجھے اس کے انداز میں تذبذب دکھائی دیا۔

”پوچھو۔“

”اگر میں جلا جاؤں گا۔ تو۔ تو کیا تم مجھے یاد کرو گی؟“ جھجکتے ہوئے اس نے پوچھا۔ میرا دل چاہا فوراً ”کہہ دوں“ نہیں، لیکن جاتے ہوئے شخص کو کیا اداس کرتی اس لیے محض اس کا دل رکھنے کے لیے میں نے کہا۔

”ہاں کیوں نہیں۔ صرف میں نہیں سب ہی یاد کریں گے۔“

حسن کے چہرے پر میں نے مسکراہٹ کو پھیلنے دیکھا، یوں لگا جیسے اس کے دل سے کوئی بوجھ ہٹ گیا

ہو۔

”تم صرف اپنی بات کرو۔“

”میں تمہیں یاد کروں گی حسن!“

کیا خوشی صرف کسی کی مسکراہٹ سے ظاہر ہو سکتی ہے؟

شاید ہاں۔ کیونکہ میں نے حسن کے چہرے پر بے پایاں خوشی کو مسکراہٹ بن کر پھیلنے دیکھا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور یوں لگا جیسے وہ اپنی خوشی چھپا نہ پا رہا ہو۔

”اور کیا تم میرا انتظار کرو گی نور؟“ اس نے پوچھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس کا سوال سوال سمجھ پاتی حسن نے کہا۔

”نور! میں چاہتا ہوں تم میرا انتظار کرو، کیونکہ یہاں سے جانے کے بعد میری زندگی کا کوئی ایک لمحہ ایسا نہیں ہو گا جب میں تمہیں یاد نہ کروں۔ تمہیں پتا ہے، کوئی کسی کو کب اتنا یاد کرتا ہے؟ جب وہ چاہتا ہے متعلقہ شخص ہمیشہ اس کے پاس رہے، میں چاہتا ہوں تم ہمیشہ میرے پاس رہو، میں اپنے گھر جانے کے بعد بھی تمہیں یاد کرتا ہوں، تم یقین کرو گی اکثر رات کو سوتے ہوئے میں تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوتا ہوں، صبح کو جب اٹھتا ہوں تو اکثر سب سے پہلے مجھے تمہارا خیال آتا ہے، مجھے تمہارا چہرہ اس طرح اذیر رہتا ہے کہ تمہیں خود بھی یاد نہیں رہتا ہوگا۔ اگر میری ڈرائنگ اچھی ہوتی تو یقیناً میں آنکھیں بند کر کے تمہارا اسکچ بنا سکتا تھا۔ مگر۔۔۔ وہ ہنسنا۔ جھجک آمیز ہنسی۔

”تم سوچ رہی ہو گی، حسن کو کیا ہوا ہے؟ میں لیبیا جا رہا ہوں، تاکہ ڈھیر سارا پیسہ کما سکوں۔ بہنوں کی شادیوں اور اپنے بہتر مستقبل کے لیے ہی نہیں۔ میں خود کو اس قابل بنانا چاہتا ہوں، تاکہ کل کو بنا جھجکے تیا ابو سے تمہیں مانگ سکوں۔ میرا انتظار کرنا نور! تمہارا انتظار میرا حوصلہ اور ہمت ہوگا۔“

اس نے میری چہرے پر الوداعی بھرپور نظر ڈالی اور چلا گیا۔ یہ نظریں اتنی گہری تھیں کہ میرے دل کی

منزلزلے سے پہلے والا سناٹا چھا گیا اور پھر اتنا کچھ پچال آیا کہ دل تو دل میرا سارا وجود ہی بل کر رہ

ہے۔ ایک اس وقت میں ٹین ایجر تھی، سولہ سال کی میں دیے بھی اتنی عقل نہیں ہوتی۔ لیکن لاپائیاں اور ”دھوپ کنارے“ جیسے سپر ہٹ ڈرامہ ہمارے دل میں بھی دیکھ رکھے تھے اور میں جانتی تھی، کوئی بہت گھما پھرا کر بات کر رہا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے۔

میں چند روز شش و پنج میں مبتلا رہی، لیکن جا کر حسن سے سب سے پہلی کال مجھے کی تھی، حال احوال پوچھ کر بند کر دیا، اس کے بعد وہ لگا تار ہر روز چند منٹ کی کال کر کے حال پوچھتا اور فون بند کر دیتا۔ واردات حق میں یہ فون کالز بھی بے حد معاون ثابت ہوئیں، ریوں نور احسان نے سولہ سال کی عمر میں محبت کے حق پر لبیک کہہ دیا تھا۔

سولہ سال کی عمر میں محبت کا جذبہ کسی فینٹسی کی طرح ہوتا ہے۔ ایسی فینٹسی جیسے انسان اپنی جان سے بھی عزیز کر لیتا ہے۔

بہر حال بار بار ”سولہ سال کی عمر میں محبت“ کا کلمہ سننے سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ پھر میں ساری زندگی اسی فینٹسی میں قید رہی۔ نہیں ایسا نہیں ہوا، شروع لے چند سال اس فسون میں قید رہنے کے بعد مجھے اور سن کو آئے وال کا بھاؤ محاورا ”نہیں حقیقتاً“ سمجھنے لگانے لگا تھا۔

لیبیا میں حسن کے ابتدائی چند سال بہترین گزرے، دور ان منیجر ہوا، آپا کی شادی ہوئی۔ چچی جان حسن کی زنی پر بے حد مسرور رہیں، بابا جان بھی خوش تھے کہ سن نے ان کے خدشات کو غلط ثابت کر دیا تھا۔ ان دنوں کسی بات پر ہسپتال کے عملے سے اس کا جھگڑا وادرا سے نکال دیا گیا۔ یہیں سے دراصل حسن کے لی اعتبار سے برے دور کا آغاز ہوا۔ اس نے کسی بہتر

ملازمت کی تلاش میں بہت دھکے کھائے۔ مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ حاصل نہ ہو سکا۔ تھک بار کر اس نے مزدوری بھی کی تب ہی ایک مخصوص رقم چچی جان کو بھجوا پاتا، لیکن یہ رقم ایسی نہیں تھی کہ اس میں سے کچھ پنس انداز کر کے بہنوں کی شادیوں کے لیے سنبھالا جاسکے۔

تب میں نے حسن کا ہاتھ بٹانے کا فیصلہ کیا، ان دنوں میں گریجویشن کے فائنل ایر میں تھی، پڑھائی کے ساتھ ساتھ میں نے ہوم ٹیوشن پڑھانا شروع کر دی۔ کچھ عرصہ ایک کال سینٹر میں کام بھی کیا۔ اپنی کوششوں سے میں جتنا کمائی وہ کسی بھی بہانے سے جا کر چچی جان کے ہاتھ پر رکھ دیتی۔ اگلے روز حسن کا فون آنا اور وہ میری اس روش پر حق کی اظہار کرتا۔

مجھے پہلی بار احساس ہوا۔ حسن، چچا جان کی طرح ہی خوددار تھا، جیسے وہ اپنے بھائیوں سے مدد لینا نہیں چاہتے تھے، اسی طرح حسن اس بات پر معترض تھا کہ میں اس کی مالی مدد کیوں کرنا چاہتی ہوں۔

”میں اپنی پریشانی کا ذکر تمہارے سوا کسی سے نہیں کرتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم مجھ پر ترس کھاتے ہوئے میری جھولی میں خیرات ڈالنا شروع کر دو۔“ وہ بے حد غصے میں تھا۔

”حد ہوتی ہے حسن! اگر میں تمہارا ہاتھ بٹانا چاہتی ہوں تمہارے مشکل وقت میں کام آنا چاہتی ہوں تو تم اسے خیرات تصور کرو گے۔“

میرے اور حسن کے درمیان کئی بار اسی موضوع پر دھواں دھار بحث ہوئی۔ میں جانتی ہوں۔ میں نے کتنی وقتوں سے اسے اپنی تھوڑی سی مدد لینے پر راضی کیا۔ راضی بھی کہاں کیا۔ میں تو بزدلی اس کی مدد کر رہی تھی، لیکن پھر یہ سلسلہ چل نکلا، میں خوش تھی کہ محبت ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے کا نام ہی تو ہے۔

بہر حال وقت یوں ہی گزرتا رہا۔ لیبیا میں حسن نے اور یہاں میں نے زندگی کو بہتر طریقے سے گزارنے کے لیے بڑی جدوجہد کی۔ اس دوران حسن نے اپنی کئی

ذمہ داریاں پوری کیں، جن میں سرفہرست منیذہ اور ماندہ آپا کی شادیاں تھیں اور عفاف آپا کا آپریشن تھا۔ ان کے دل میں بچپن سے سوراخ تھا۔ جس کا علاج اب کروایا جا رہا تھا جس روز ماندہ آپا کی رخصتی تھی حسن نے فون پر مجھ سے کہا۔

”تھینک یو سوچ نویر! یہ سب صرف تمہاری وجہ سے ممکن ہو سکا۔ اگر تم جذباتی اور مالی اعتبار سے میری اتنی مدد نہ کرتیں تو میں کبھی اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر ہی بہت خوشی محسوس ہوتی ہے کہ تم صرف میرا مقدر ہو۔“

وہ بے حد شکر گزار ہو رہا تھا میرا ڈھیروں خون برہہ گیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ شکر گزاری کا اظہار کر رہا تھا بلکہ اس لیے کہ حسن دنیا کا وہ واحد شخص تھا جس کی خوشی اور اطمینان مجھے ایک ناقابل بیان مسرت میں مبتلا کر دیتا تھا۔

جس وقت عفاف آپا کی شادی ہوئی، حسن کو لیبیا گئے نو سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ میں اور حسن باقاعدہ ایک دوسرے سے منسوب نہیں ہوئے تھے، لیکن کسی نہ کسی طرح یہ خبر سارے خاندان میں پھیل چکی تھی۔ شاید اسی لیے انگوٹھی پہن کر ایک دوسرے سے منسوب ہونے کا خیال ہمیں نہیں آیا۔ پھر ہمارے گھر والے بھی اس رشتے کے حق میں تھے، سو ہمیں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

عفاف آپا سے چھوٹی شمسہ آپا تھیں جو عمر میں مجھ سے پانچ سال بڑی تھیں۔ چچی کا ارادہ تھا۔ شمسہ آپا کے ساتھ ہی میری اور حسن کی شادی کر دی جائے، لیکن ان ہی دنوں ایک عجیب مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ حسن جس سپر اسٹور پر بطور مینجر کام کر رہا تھا۔ اس اسٹور کے مالک کا قتل ہو گیا اور شک کے گھیرے میں حسن بھی آگیا، کیونکہ وہ ان چند لوگوں میں سے تھا جنہیں واردات سے چند گھنٹے قبل اس آدمی کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔

بڑی مشکل گھڑی آن پڑی تھی، حسن کی تاکید تھی اس کے گھر میں یہ بات کسی کو نہ بتائی جائے، جبکہ

میرے بابا جان فاروق بھائی اور فیروز بھائی یہاں ہیں۔ اس کی رہائی کے لیے کوششیں کر رہے تھے۔ کچھ ہائی پائادیں۔ بیان کرتے ہوئے صرف ایک جملہ محسوس کرتی ہیں، لیکن جس پر ہتی ہو، اس کے لیے وہ ہر ایک زمانہ ہوتا ہے۔

حسن بے گناہ تھا۔ میں جانتی تھی، کیونکہ اس نے مجھے خود سے بھی زیادہ بھروسہ تھا، لیکن لیبیا کی حکومت میرے بھروسے کو نہیں مانتی تھی۔ انہیں گواہ اور شواہد چاہیے تھے جو حسن کو بے گناہ ثابت کرتے۔ بابا جان نے عفاف آپا اور شمسہ آپا کی شادیاں اسی عرصہ میں کروائیں۔ اس کے بعد فاروق بھائی اور آذر لیبیا گئے وہاں جا کر انہوں نے حسن کے لیے بہترین وکیل کہا اور یوں تقریباً پانچ سال کی اذیت ناک کشمکش کے بعد حسن کو رہائی نصیب ہو سکی۔ حسن بے گناہ ثابت ہو چکا تھا، لیکن اس ملک کے قانون کے مطابق (اس وقت کے قانون کے مطابق) اصل قاتل کا پتہ نہ مل جاتا، حسن ملک سے باہر نہیں جاسکتا تھا۔

اور اب پورے سترہ سال کے بعد۔ جی ہاں پورے سترہ سال بعد حسن پاکستان آ رہا تھا۔ سترہ سال بظاہر دو لفظ ہی تو ہیں، لیکن میری اور حسن کی زندگی بہترین دور ان ہی سترہ سالوں کی جدوجہد کی نذر ہو گئی، کیا آپ ایسے انسان کی خوشی کا احساس کر سکتے ہیں جس نے ایک خوشی کے لیے سترہ سال انتظار کیا ہو؟



”پتا ہے نویر پھوپھو! میرا دل چاہتا ہے میں بھی از جلد آپ کی عمر کی ہو جاؤں اور اس عمر میں اتنی گریس فل اور بنگ لگوں جتنی کہ آپ لگتی ہیں۔ عفیوہ میرے ساتھ کبیل میں گھسی بیٹھی تھی۔ ماریہ بھابھی کی مجھ سے چیقلش کے باوجود ان بچے خصوصاً عفیوہ مجھ سے بہت اٹیچ تھے۔ فاروق بھائی کی سب سے بڑی اولاد تھی اور اسے بھتیجیوں، بھتیجیوں میں مقابلے میں مجھے اس سے محبت محسوس ہوتی تھی۔“

”تم اتنی بیک اتج میں بھی بہت گریں فل لگتی ہو۔“ میں نے پیار سے اس کا گل تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”وہ اس لیے کیونکہ میں آپ کو کاپی کرتی ہوں“ دیکھیں میں نے نیا ہیرکٹ بھی کرایا ہے۔ جو یہ لوگوں کو میں نے آپ کی پچھو دکھائی تھیں کہ دیکھو یہ ہیں میری پھوپھو۔ جن کی میں اتنی بڑی Admirer (معترف) ہوں۔ تو جب میں نے نیا ہیرکٹ کرایا تو میری فرینڈز کہنے لگیں عفیوہ! تم تو بالکل اپنی پھوپھو کی ٹوین سسٹر (جڑواں بہن) لگ رہی ہو۔ بیوی! مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ بس۔“

عفیوہ بہت پر جوش ہو کر بول رہی تھی اور میں پیار سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کندھوں تک آتا ہیرکٹ جو اس کی لمبی گردن کی وجہ سے اور بھی بچ رہا تھا۔

”لیکن ایک بات ہے نویر پھوپھو! میرا دل چاہتا ہے“ میں بالکل آپ کے جیسی لگا کروں۔ جو جو خصوصیات آپ میں ہیں وہ سب مجھ میں بھی ہوں، لیکن میں نہیں چاہتی کہ میرا دل آپ کے جیسا ہو۔“ اس نے لمحہ بھر کا توقف کرتے ہوئے کہا۔

”ارے۔۔۔ کیوں بھئی۔۔۔ میرے دل میں کیا برائی ہے؟“ میں نے اپنے بالوں کو ریڈ ہینڈ میں جکڑتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کا دل ضرورت سے کچھ زیادہ ہی اچھا ہے۔ ایکچوئنگی یہ ہی آپ کی سب سے بڑی برائی ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا، مجھے نہ جانے کیوں ہنسی آگئی۔

”کیا کسی کا دل اچھا ہونا اس کی شخصیت کی برائی ہو سکتا ہے؟ ناممکن۔“

”آپ کی اپنی بات ہے نا“ اس لیے آپ نہیں مانیں گی، بلکہ میں تو کہوں گی آپ اور حسن انکل دونوں ہی اس معاملے میں کورے ہیں۔ اپنی زندگی کا بہترین دور آپ دونوں نے اس جدوجہد کے نام کرویا جس کا فائدہ صرف اور صرف حسن انکل کی بہنوں کو ہوا۔ میں نے تو سوچ لیا ہے گوکہ میں آپ کے جیسی ضرور بننا چاہتی

ہوں، لیکن اتنا Sacrifice (ایثار) کبھی نہیں کروں گی۔

بائے داوے نویر پھوپھو! آپ کو عفاف آئی بھی کوئی خبر ہے؟“ عفیوہ نے کچھ یاد آنے پر پوچھا: عفاف آپ کا نام سن کر چونک گئی۔

”میری فرینڈ ہے ناسطوت؟ اس کا گھر عفاف آ کے گھر کے قریب ہی ہے میں نے اسے بتایا تھا عفاف آئی میرے بابا کی فرسٹ کزن ہیں۔ سطوت رہی تھی۔ دو تین دن قبل عفاف آئی کے گھر بہت جھگڑا ہوا تھا اور ان کے فرینڈز نے عفاف آئی ٹارچر کرنے کے بعد گھر سے نکال دیا تھا۔“

عفیوہ سنجیدگی سے بتا رہی تھی اور میں ساری بات سن کر ہونچکا رہ گئی تھی۔

”کبھی کبھی تو مجھے سخت بے زاری محسوس ہو لگتی ہے“ آخر تقدیر نے ہمارے لیے کیا سوچا ہے۔ سال بعد اگر ہمارے ملنے کی کوئی راہ نکل ہی رہی تھی تقدیر نے ایک نئے مسئلے کو لا کر ہمارے درمیان دیا۔“

تقریباً ایک ہفتہ کے بعد میری حسن سے بات ہو رہی تھی اور وہ بے حد پریشان اور دل گرفتہ لگتا تھا۔ میرے اپنے دل کی حالت بھی عجیب سی ہو رہی تھی۔ محض چند روز قبل میں کتنا خوش تھی، مگر اب عفاف آپا کے میاں بے حد لالچی طبیعت کے واقع ہونے تھے جیسے ہی انہیں حسن کے پاکستان کی اطلاع ملی۔ انہوں نے پانچ لاکھ روپے کی سامنے رکھ دی۔ بقول ان کے وہ کوئی کاروبار شروع چاہ رہے تھے جس کے لیے انہیں رقم درکار تھی بیوی کے بھائی کا فرض تھا کہ انہیں رقم فراہم کریں انہوں نے عفاف آپا کو مجبور کیا کہ جا کر اپنے بہنوں سے رقم لائیں۔ عفاف آپا کے انکار پر انہیں بری طرح زد و کوب کر کے گھر سے نکال دیا لیکن کچھ روز بعد وہ خود ہی عفاف آپا کو منہ دے کر

سے واپس لے گئے تھے۔ حسن سے رقم کے مطالبے اور طلاق کی دھمکی کے ساتھ۔

”پریشان مت ہو حسن۔“ میں نے تسلی دینا چاہی تھی، لیکن میں جانتی تھی میرے الفاظ بالکل بے وزن تھے۔

”کیسے پریشان نہ ہوں۔ تمہیں پتا ہے میری جیب بالکل خالی ہے۔ پہلے کیس پر پیسہ لگتا رہا۔ سیونگ تو نہ ہونے کے برابر رہی ہے۔ اب میرے پاس صرف اتنی رقم ہے کہ میں ویزا لگوا کر واپسی کا ٹکٹ خرید سکوں۔ میں نے پاکستان میں کوئی کاروبار سیٹ کرنے کا سوچ رکھا ہے پھر شادی کے اخراجات بھی ہیں۔ تم خود سوچو پانچ لاکھ عفاف آپا کو دیتا ہوں تو یہ سارے کام کیسے پورے ہوں گے۔“

”تم فکر مند نہ ہو حسن! اللہ کوئی نہ کوئی سبب بنا دے گا۔“ میں نے بو جھل آواز میں کہا کہ آنسوؤں کا کوہِ بری طرح حلق میں پھنس رہا تھا۔

”بہت سوچنے کے بعد مجھے تو ایک ہی راستہ دکھائی دے رہا ہے۔ جب عفاف آپا کی پریشانی دور کرنا ہی ہے تو ہلد کچھ کرنا پڑے گا۔ میں جس فیکٹری میں کام کرنا ہوں وہاں سے ایڈوانس مل سکتا ہے۔ لیکن وہ رک۔“

”لیکن کیا؟“ میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ”مجھے کنٹریکٹ برہانا پڑے گا اور اس دوران میں اتنا بھی نہیں آسکوں گا۔ جو ایڈوانس دیں گے ان کی اپنی بھی کچھ سیکیورٹیز ہوں گی۔ ہماری شادی پھر کرنا پڑے گی۔ ہم مزید کچھ سال ایک دوسرے میں ٹل سکیں گے۔ ہم پھر ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکیں گے۔“

”بو جھل اور دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا، میں تسلی بولنے کی کوشش کرتی تو آواز کی نمی پہلے اس کی نالی جاتی۔ اور یقیناً حسن جذبات میں آکر اس کے آنے کا فیصلہ کر لیتا۔“

”ہماری عفاف آپا! مرو کی بے وفائی کی جیتی

جاتی مثال۔“ پوری بات سننے کے بعد نمل نے تأسف سے کہا تھا۔

آذر نے مجھے اور نمل کو ڈنر پر انوائٹ کیا تھا۔ نمل کا بگڑا مزاج درست کرنے کی کوشش تھی اچھی بات یہ کہ نمل نے اپنی عادت کے برخلاف زیادہ خرچے نہیں دکھائے تھے، بلکہ اپنی ناراضی پس پشت ڈال کر آگئی تھی۔

”محض پانچ لاکھ کے لیے ایک عورت کی زندگی اجیرن کر رہی ہے، دیکھ لو نویر! میں کہتی ہوں نا، مرد بے وفا ہوتا ہے، یہ ایک اور مثال سامنے آگئی ہے۔“

”تمہیں شاید بے وفائی کا مطلب نہیں پتا۔“ ایک دم آذر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔

”مجھے پتا ہے۔“ نمل نے اپنے مخصوص ”مجھے سب پتا ہے“ والے انداز میں کہا۔

”غلط۔ بالکل غلط۔ تمہیں نہیں پتا، بے وفائی کیا ہوتی ہے، جس روز سامنا ہو گا بے وفائی سے۔ عقل ٹھکانے آجائے گی۔“

”دیکھ لو نویر! یہ ابھی سے مجھے دھمکیاں دے رہا ہے۔ شادی کے بعد کیا کرے گا۔“ نمل نے تڑپ کر میری طرف رجوع کیا تھا۔

”پلیزیار! تم لوگ اب جھگڑامت شروع کر دو، میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔

”پریشانی کی کیا بات ہے نویر! جتنی رقم عفاف آپا کو چاہیے اتنی تو میں بھی دے سکتا ہوں۔“ آذر نے کہا۔

”عفاف آپا تم سے مدد لینے کے لیے کبھی راضی نہیں ہوں گی آذر۔“ میں نے کہا۔ ”لٹا ان کی خودداری پر تو بڑی بری چوٹ لگ جائے گی جب انہیں یہ پتا چلے گا کہ ان کے گھریلو حالات کی خبر سارے خاندان میں پھیل گئی۔“

”تو عفاف آپا کو بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تم کہہ دینا حسن نے مجھوائے ہیں۔“

”تمہیں نہیں پتا آذر! حسن تو اور برا مانے گا، اگر میں نے تم سے پیسے لیے تو۔۔۔“

”ارے تو حسن کو بھی بتانے کی کیا ضرورت ہے،

کہہ دینا تمہارے اپنے ہیں۔“ آذر نے جھنجھلا کر کہا۔

”لیکن۔۔۔“ کوئی لیکن ویکن نہیں مجھے پتا ہے کہ تم کتنی پریشان رہو گی۔ کیا میں اپنی فرینڈ کی اتنی سی بھی مدد نہیں کر سکتا۔ نمل! تم ہی اسے سمجھاؤ۔“

”آل۔۔۔ ہاں“ آذر ٹھیک کہہ رہا ہے لویر! نمل نے جیسے ناچار کہا تھا۔ مجھے ہنسی آگئی اب اتنا تو میں نمل کو جان ہی گئی تھی۔

”اور میں کون سا تمہیں یا حسن کو یہ رقم تحفہ دے رہا ہوں یا! اتنی منگانی کے دور میں کوئی کسی کو ایسا تحفہ نہیں دیتا۔ اس لیے جب تم لوگوں کے پاس اتنی رقم ہو واپس لوٹا دیتا۔“ آذر نے بات جاری رکھی تھی۔

”شکریہ آذر۔“ میں نے ”شکر“ بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”حسن نے اپنی فیکٹری میں بات کی ہے اگر اسے دو سال کی تنخواہ ایڈوانس میں مل گئی تو عفاف آپا کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔“ میں کرسی کھڑکا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کھانا ہم کھا چکے تھے اور آذر اور نمل نے کافی آرڈر کی تھی۔

”دوسال؟“ آذر نے تعجب سے کہا۔ ”پھر تو حسن مزید دو سال پاکستان نہیں آسکے گا۔ تم دونوں اپنے ساتھ کر کیا رہے ہو نویر! مجھ سے مدد لینے میں کیا دقت ہے؟“

”اگر کو تو میں حسن سے بات کروں؟“ مجھے خاموش دیکھ کر آذر نے پوچھا۔

”میں بات کروں گی۔“ چند لمحوں سوچنے کے بعد میں نے کہا۔ ایسا صرف میں نے آذر کو مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیا تھا کیونکہ میں جانتی تھی حسن بھی قائل نہیں ہو گا لہذا اس نے تو اسی بات پر خفا ہو جانا تھا کہ آذر عفاف آپا کی پریشانی سے واقف ہے۔

بعض اوقات خود داری بھی مصیبت بن جاتی ہے۔ ”میں ذرا ایگزیشن دیکھ کر آتی ہوں۔“ ریسٹورنٹ کے اوپن ایئر میں پیٹری کرافٹس کی نمائش لگی ہوئی

تھی۔ میں آذر اور نمل کو کچھ دیر تنہائی فراہم کرنے کے خیال سے ہمانا بنا کر وہاں سے ہٹ گئی۔ آذر کے اصرار پر کہاب میں ہڈی بن کر آگئی تھی مگر میں جانتی تھی ان دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزار کر گلے شکوے کرنے کی ضرورت تھی۔

کاریڈور کے کونے پر پہنچ کر میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ دونوں بھی شاید میرے منظر سے ہٹنے کے ہی منتظر تھے اب آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ڈانٹا گزبوتے میں مصروف ہو چکے تھے مجھے ہنسی بھی آئی اور حسن کی یاد بھی۔ ایک گہری سانس بھر کر میں نے سر جھٹکا اور آگے بڑھی۔

تب ہی کسی نے مجھے میرے نام سے پکارا میں نے دیکھا لمبے قد اور مضبوط جسمت کا شخص تھا جس کی شکل مجھے کچھ جانی پہچانی سی لگی مگر فوری طور پر یاد نہیں آیا کہ اسے کہاں دیکھ چکی ہوں۔

”مس احسان! شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں میں باسٹ ملک ہوں۔ آپ سے بینک۔“

وہ ابھی کہہ ہی رہا تھا کہ میرے ذہن میں جھمکا کہ سا ہوا اور منظر واضح ہوتا چلا گیا۔

”ارے باسٹ ملک! آپ تو ہمارے فیصل بینک کے اتنے بہترین کلانٹس میں سے ہیں۔“ میں نے پروفیشنل مسکراہٹ لبوں پر سجا کر کہا۔ باسٹ صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”اچھا ہوا۔ آج یہاں آپ سے ملاقات ہو گئی ورنہ کل میں آپ سے ملنے گلبرگ براچ آئی رہا تھا۔“ اس کی بات پر میں حیران ہوئی اور کچھ نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

”آپ کو یاد ہو گا چند مہینے پہلے میں نے آپ کو بطور آر جے کام کرنے کی آفر دی تھی؟“

باسٹ ملک بینک آئے تھے میں اسی حوالے سے انہیں جانتی تھی۔ وہ کسی ٹی وی اور ریڈیو چینل سے وابستہ تھے اور ان کے چینل کا زیادہ تر لین دین ہمارے بینک کے توسط سے ہوتا تھا اسی سلسلے میں باسٹ ملک صاحب کا بینک آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔ ایک روز انہوں

نے واقعی میری وائس کو الٹی (آوان) کی تعریف کرتے ہوئے مجھے اپنے ریڈیو چینل پر آر جے کے طور پر کام کرنے کی پیشکش کی تھی جسے میں نے فی الفور رد کر دیا کہ بہر حال۔

مجھے اس کام میں بالکل دلچسپی نہیں تھی دوسرے میرا خیال تھا آر جے بننے کے لیے محض وائس کو الٹی ہی ضروری نہیں ہوتی آپ کو بے ٹکان ہنار کے بولنے کا سلیقہ بھی آنا چاہیے۔ مجھے پتا تھا کوشش کے باوجود بھی میں اتنا نہیں بول پاؤں گی۔

”مجھے یاد ہے ملک صاحب! لیکن میرا نہیں خیال کہ میں اس کام کے لیے سوٹ ایبل ہوں۔“

میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا ملک صاحب پھر مسکرانے لگے جیسے کسی کی کم فہمی پر مسکرایا جاتا ہے۔

”مجھے اچھی طرح سے آپ کا جواب یاد ہے مس احسان! لیکن اس بار میں آپ کو anchoring (میزبانی) کے لیے نہیں کہہ رہا۔ دراصل میں ایک پروڈکشن ہاؤس سے منسلک ہوں اور ہم لوگوں نے عورتوں پر تشدد کے موضوع پر ڈاکیومنٹریز تیار کی ہیں میں چاہتا ہوں ان ڈاکیومنٹریز کی کنٹنری آپ سے کروایا جائے۔“

”لیکن ملک صاحب! میں نے کہنا چاہا۔“

”معذرت چاہتا ہوں کہ آپ کی بات کاٹ رہا ہوں۔ آپ ایک بار سنجیدگی سے اس آفر پر غور ضرور کریں۔“

دراصل آپ لمبے کی خوب صورتی الفاظ کی ادائیگی کا طریقہ کار، شین قاف سے درست تلفظ۔ اگر بالکل غیر جانب داری سے تجزیہ کیا جائے تو یہ ایسی خصوصیات ہیں جو فی زمانہ بہت کم لوگوں کے پاس ہیں اب اگر آپ ان خوبیوں کو بروئے کار نہیں لاتیں تو یقین مانئے یہ آپ کی نا انصافی بلکہ نا قدری ہوگی۔“

انہوں نے اتنے تاسف بھرے انداز میں کہا کہ مجھے فوراً ہنسی آگئی اور جسے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر میں نے بشکل رد کا۔

”اب تو آپ مجھے اموشنل کر رہے ہیں۔“ ”آپ یہ میرا کارڈ رکھیے اس آفر پر غور کریں میں جانتا ہوں آپ میں اتنی صلاحیت ہے کہ آپ بہت آگے تک جاسکتی ہیں۔ بس تھوڑی جھجک ہے جسے دور کرنا پڑے گا۔“

میں حیرانی سے باسٹ ملک کے اپنے بارے میں اندازے بن رہی تھی۔

”ہم شیڈول آپ کی سہولت کے حساب سے سیٹ کریں گے اس طرح کہ آپ کی ملازمت بھی متاثر نہ ہو پھر اس کام کے لیے آپ کو بہت معقول معاوضہ بھی ادا کیا جائے گا مس احسان! اس بارے میں ضرور سوچئے گا۔“ اور اب میں نے اس کا وزٹنگ کارڈ پکڑ لیا۔

”میں آپ کو کل یا پرسوں تک سوچ کر انفارم کروں گی۔“

”مالی ہلیڈر۔“ وہ خوشی خوشی رخصت ہوا۔ میں وزٹنگ کارڈ کو دیکھتی روش کی طرف آگئی جہاں نمل اور آذر میرا انتظار کر رہے تھے۔

”یہ تم کس ہینڈ سم سے باتیں کر رہی تھیں۔ وہ بھی اکیلے اکیلے۔“ نمل نے آنکھیں منکا کر پوچھا میرا دل غ جو باسٹ ملک کی ”معقول معاوضے والی بات“ میں اٹکا ہوا تھا چونک سی گئی۔

”یہ باسٹ ملک تھے۔ ہمارے بینک کے اکاؤنٹ ہولڈر اکثر بینک آتے رہتے ہیں لیکن میرا خیال ہے جب سے تمہارا اپائنٹمنٹ ہوا ہے یہ ایک بار بھی نہیں آئے۔“ میں نے بتایا۔

”واہ بھئی۔ بینک میں تو بڑے ہینڈ سم لوگ آتے ہیں میرا خیال ہے اس جاب کو پھر مستقل کروانے کے لیے مجھے کوئی چلہ کاٹ لینا چاہیے۔“ وہ ذرا بھی سنجیدہ نہیں تھی۔

”تھوڑی شرم کرو نمل! مگتیر کے سامنے کسی دوسرے کو ہینڈ سم کہتے تمہیں لحاظ کرنا چاہیے۔“ آذر نے بھی اسے غیر سنجیدگی سے لتاڑا۔

”اچھا ان مگتیر صاحب کا لحاظ اس وقت کہاں تھا

جب ساتھ والی ٹیبل کی اس حسینہ کو گھور رہے تھے کہ تنگ آکر مجھے خود ہی اٹھنا پڑا۔“
ان دونوں کا اپنا جھگڑا چھڑ گیا جو گھر پہنچنے تک بھی جاری رہا۔

”مجھے لگتا ہے جس کام کے لیے آئے ہیں اسے پورا کیے بغیر ہی واپس جانا پڑے گا۔ فاروق! آخر آپ نور سے بات کیوں نہیں کرتے؟“ فاروق بھائی اور ماریہ بھابی شام سے آئے ہوئے تھے کھانا کھانے کے بعد بھائی جان نے مجھ سے چائے کی فرمائش کر دی۔ میں چائے کی ٹرے لے کر لیونگ روم کی طرف آ رہی تھی جب ماریہ بھابی کی جھنجھالی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”میری اور نور کی بول چال بند تو نہیں ہے۔ پھر جب سے ہم آئے ہیں میں نور سے باتیں ہی تو کر رہا ہوں۔“ بھائی جان نے لاپرواہی سے کہا۔

”اب بنیں مت۔ آپ کو پتا ہے میں کیا کہہ رہی ہوں۔“ بھابی بے ناراضی سے کہا۔ نور سے شادی کے متعلق پوچھیں۔ آخر کب تک ہم عفیوہ کو آپ کی بہن کی وجہ سے گھر میں بٹھا کر رکھیں گے۔“

”ماریہ! کبھی تو سوچ سمجھ کر بات کر لیا کرو۔“ میں نے بھائی جان کی جھنجھالی ہوئی آواز سنی اس کے بعد کی بات میں سن نہیں سکی کیونکہ بھائی جان نے آواز بے حد دھیمی کر لی تھی۔

”بس جیسے ہی اس بہن کا ذکر آئے آپ بھڑک اٹھا کریں۔ آپ کیا چاہتے ہیں نور کی طرح عفیوہ بھی گھر بیٹھی بوڑھی ہو جائے۔“

”تمہیں نہیں پتا نور کی شادی کیوں ملتوی ہو رہی ہے۔ حسن آج پاکستان آجائے تو کل نور کی شادی کروں۔“

”معاف کیجیے گا فاروق صاحب! لیکن مجھے لگتا ہے کہ حسن کے نہ آنے کا تو صرف بہانا ہی ہے دراصل تو آپ کی بہن صاحبہ ہی شادی کرنا نہیں چاہتیں۔ سچ

ہے بھی جن لڑکیوں کو آزادی زندگی گزارنے کا جسکے لگ جائے پھر وہ گھر کیوں بسائیں گی۔“
”ماریہ! اب تم نے اپنی زبان بند نہیں کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“

میں نے فاروق بھائی کو کہتے سنا۔ اس کے بعد مجھے تو خاموش ہو گئیں لیکن میرے اندر اٹھل پٹھل مچ گئی۔ میرے وہ ممکن میں بھی نہیں تھا کہ کوئی یہ سوچ سکتا ہے کہ میں خود ہی شادی کو ٹل رہی ہوں۔ خصوصاً میرے قریبی لوگ۔ اب میں ماریہ بھابی کس طرح بتاتی کہ میں نے ان گزرے سالوں میں حسن کی کمی کو کتنا محسوس کیا ہے کتنی مرتبہ دنیا کی چھٹی ہوئی نظروں کا حوصلہ مندی سے مقابلہ کیا ہے۔

مرتبہ تنہائیوں سے لڑی ہوں صرف اور صرف اس لیے کیونکہ میں جانتی تھی ایک شخص ہے جو ہمارے فیملی میں معاشی جدوجہد کرتے ہوئے مجھ تک پہنچنے کے لیے بے چین ہے۔ کہتے ہیں دنیا کی زبان دو دھاری تلوار ہوتی ہے۔ اور میرے لیے ماریہ بھابی دنیا کی تھیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے لیکن دنیا کا خوف دنیا کی زبان کا خوف، دنیا کی چھیدی ہوئی نظروں کا خوف اور کے الزامات کا خوف۔ انسان کے لیے ہر اس ڈر سے ثابت ہوتا ہے عموماً جو غیر مرئی مخلوق سے وابستہ ہو ہے۔ یہی خوف انسان سے بڑے بڑے فیصلے کروا دیتا ہے۔ کبھی سود مند کبھی نقصان دہ۔

میں جو باسط ملک سے معقول معاوضے کا سن کر شش و پنج کا شکار تھی ”دنیا“ کے ایک ہی دھکے نے دھکیل کر نتیجے کی سرحد پر پہنچا دیا۔

میں نے اسی وقت اندر جا کر بھائی جان کو حسن پاکستان آنے کی اطلاع سنائی اور اگلے روز آفس میں نے باسط ملک کو فون پر بتا دیا کہ میں ان کے کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔

پہلے ہفتے میں میں نے دو پچیس پچیس ڈاکیومنٹریز کا وائس اوور (voice over) مکمل

اور مجھے اس کا معقول معاوضہ ملا تھا۔ یہ معاوضہ میری حالت سے کہیں زیادہ تھا۔ میری بڑھتی ہوئی دلچسپی اور اگلی کو دیکھتے ہوئے باسط نے مجھے اپنے پروڈکشن اس کی طرف سے کچھ اور کام دلایا۔ کچھ میں نے ایک سے لون لیا اور اپنا زیور بھی بیچا میرے پاس رقم جمع ہو گئی تھی کہ عفاف آپا کو دے دوں۔ حسن کے فیکٹری میں ورک پر مٹ کے ابھی دو ہفتے ہوتے تھے لیکن وہ بے حد مطمئن ہو چکا تھا اور میں

آنے والی زندگی کو حسن کے ساتھ گزارنے کا خیال اتنا خوش کن تھا کہ میں بنا پروں کے ہواؤں میں لے گئی تھی۔

اپنی کار اور منیجر آپا کے لیے ”ہاؤس فائننس“ کی صورت میں بینک سے حاصل کی ہوئی (favour) کی کوئی ہر مہینے میری تنخواہ سے ہوتی تھی۔ تنخواہ آدھی سے بھی کم رہ جاتی اور مجھے

فیملی میں محفل موسیقی کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ باسط ملک نے انویٹیشن کارڈ کے ساتھ کچھ انٹری اس کے بھوائے تھے جنہیں دیکھ کر نمل اور آذر کا دل اٹا۔ نمل ایک ہفتے سے چھٹی پر تھی جبکہ اپنی اولی مصروفیت کی بنا پر کئی روز سے آذر سے بات نہیں ہو پاتی تھی۔ ساتھ ہی مجھے چند روز قبل سے ہونی گفتگو یاد آ گئی۔

اس روز نمل کاموڈ بے حد خراب تھا دو بار اسے صاب سے ڈانٹ بھی پڑ چکی تھی۔ میں نے

”میری زندگی میں کوئی ایک مسئلہ نہیں ہے نور! تنگ سو گے کہاں تک سنائیں۔“ اس نے مصرعہ بگاڑا۔ ”مینجر صاحب چھٹی دینے پر نہیں ہیں گھر میں والدہ صاحبہ کے میکے والے آ رہے ہیں۔ اوپر سے آذر بھی کم نہیں ہے

تمہیں پتا ہے اب اس نے کیا کیا ہے؟“
میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی اور نمل نے جو بتایا اسے سن کر میرا بھی دل چلا اپنا سر پیٹ لوں۔ نمل تو ناراضی میں حق بجانب تھی۔
میں نے کارڈ اور پاس ایک طرف رکھ کر نمل کو فون ملایا لیکن نمل کا سیل فون آف ملا۔ لینڈ لائن پر کال کی تو پتا چلا کہ وہ گھر پر نہیں تھی میں نے مہمانوں کی بابت پوچھا تو اس نے کہا سب لوگ جا چکے ہیں۔ صرف لیتھ ماموں ہمارے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

میں نے آذر کو کال ملائی۔
”نمل سے تمہاری بات کب ہوئی تھی؟ میں تو کب سے ٹرائی کر رہی ہوں لیکن اس کا سیل آف ہے۔“

”دس روز پہلے بات ہوئی تھی۔ آج اس کا سیل آف ہے تو میں کیا بتا سکتا ہوں۔“
”دس روز پہلے۔“ میں نے تعجب سے دوہرایا۔
”رومیو جولیٹ نے دس روز ایک دوسرے سے بات کیے بغیر صبر کیسے کر لیا؟“ میں نے شرارتی انداز میں پوچھا۔

”تمہیں پتا تو ہے جولیٹ کتنی نخریلی اور جھگڑالو ہے۔ ناراضی اور غصہ تو اس کی ٹاک پر ہوتا ہے۔“ اس نے بھی میرے انداز میں کہا۔

”تم نے حرکت ہی ایسی کی ہے آذر! کہ نمل اپنی ناراضی میں بالکل حق بجانب ہے۔ تمہیں کیا ضرورت تھی اچھی خاصی نوکری چھوڑ کر شیفت بننے کی۔“

”تم سے کس نے کہا۔ میں نے نوکری چھوڑ دی؟“ آذر کو جیسے میری باتیں سن کر دھچکا لگا تھا۔
”کون بتائے گا؟“

”نمل کا داغ خراب ہے۔“ وہ جھنجھلا کر بولا۔
”میں نے اسے ساری بات تفصیل سے بتائی تھی۔ پھر بھی نور میں نے جاب چھوڑی نہیں ہے۔ کچھ عرصہ کی چھٹی پر ہوں ایک انٹرنیشنل ریسٹورنٹ کی چین کھل رہی تھی یہاں وہاں کچن اسٹاف کی ضرورت تھی۔ میں جسٹ فار فرائز لے کر آیا ہوں۔“

نور میں یونہی چلا گیا تھا وہاں مستقل ملازمت کا ارادہ نہیں تھا میرا کیونکہ آج کل ریٹائرمنٹ میں بھی صرف تجربے کی بنیاد پر نوکری نہیں ملتی۔ ڈگری چاہیے ہوتی ہے جو مکمل بیگم کی مہربانی سے مجھے تاحال نہیں مل سکی۔ اس کے باوجود بطور اسٹنٹ شیف میرا سلیکشن ہوا ہے سیلری بھی اچھا ہے۔ میں نے سوچا نعمت غیر مترقبہ کو ٹھوکر مارنا کہاں کی عقل مندی ہے۔

اس کی آواز خوشی سے بوجھل ہو رہی تھی۔
”یہ کام کرنا کتنا بڑا خواب تھا میرا اب غیر متوقع پر اس خواب کو پورا کرنے کا موقع مل رہا ہے تو میں کیوں فائدہ نہ اٹھاؤں۔ نمل یہ بات نہیں سمجھ رہی کہ جس کام کو کرتے ہوئے میں دلی خوشی محسوس کر رہا ہوں، اسے چند مہینے کر لینے میں کیا برائی ہے۔ جلد یا بدیر مجھے اپنی پرانی جاب پر واپس چلے ہی جانا ہے۔ پھر جھگڑا کیسا؟۔ دل کی خوشی کے بغیر جب انسان کوئی کام کر رہا ہوتا ہے تو اس کی satisfaction (تسکین) نہیں ہوتی اور satisfaction کے بغیر روٹ کام کرتے ہیں انسان نہیں۔ مجھے لگتا ہے میں پچھلے کئی سالوں سے نیلسن کے سچے سچائے آفس میں بیٹھا روٹ کی طرح کام کر رہا ہوں دل کی خوشی اور satisfaction (اطمینان) کے بغیر نمل سے کہو جو میں کرنا چاہتا ہوں کر لینے دے۔ صرف چند مہینوں کے لیے اسے ایک محفوظ اور خوش حال مستقبل فراہم کرنا میری ذمہ داری ہے۔ میں کیسے کروں گا۔ یہ بھی میری ذمہ داری ہے۔ پھر نمل کی ناراضی اور خدشات کس لیے ہیں۔“

وہ بے حد اکتایا ہوا اور نا سمجھی سے بول رہا تھا جیسے بڑی دقتوں کے بعد بھی نمل کا ذہن نہ بڑھ پارہا ہو۔
”میں تمہاری ہر بات مانتی ہوں آؤ! لیکن تم دونوں کب تک ایسی باتوں پر جھگڑتے رہو گے؟ ایک مرتبہ بیٹھ کر ان معاملات کو سمجھا کیوں نہیں لیتے۔“ میں نے مخلصانہ انداز میں کہا۔

”یار نور! یہ تو بڑے عام قسم کے جھگڑے ہیں جنہیں ایک نہ ایک دن سلجھ ہی جانا ہوتا ہے خصوصاً“

اگر محبت ہو تب تو ضرور ہی ”سلجھ“ جاتے ہیں۔ تم بے فکر رہو۔ میں نمل کو منالوں گا۔“
نمل کی طرح آؤر کی شکایات بھی ہنوز تھیں لیکن دلچسپ بات یہ کہ اس کے پاس ان شکایات کا توڑ بھی تھا جس کا نام تھا ”محبت“
میں نے سب سنا اور گہری سانس بھر کر فون بند کر دیا۔

☆ ☆ ☆
اے عشق ہمیں اتنا تو بتا
انجام ہمارا کیا ہوگا
تقدیر بتا اب اس سے برا
انجام ہمارا کیا ہوگا
سارے میں منی بیگم کی دلکش آواز نے سماں باندھ رکھا تھا جب سارہ نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے مجھے باسط کا پیغام دیا۔
”سرباسط! تمہیں باہر بلا رہے ہیں۔“ میں سہلہ کر غزل سنتی رہی کہ یہ غزل میری بہت پسندیدہ تھی پھر عفیوہ کو بتا کر ہال سے باہر آئی۔ میری توقع کے برخلاف عفیوہ فوراً ”میرے ساتھ آنے پر راضی ہو گئی تھی اور اب بہت لطف اندوز بھی ہو رہی تھی۔
باسط کو میں نے برآمدے میں کھڑے دیکھا تھا۔ میرے قریب پہنچنے پر وہ جو اطمینان سے سگریٹ پی رہا تھا اس نے سگریٹ فوراً ”بجھا دی۔“ مجھے اس کا یہ انداز اچھا لگا۔ باسط بلاشبہ بہترین انسان تھا اور مجھے اس کی کچھ عادات بہت ہی پسند آئی تھیں۔ اپنے کام سے بے حد لگاؤ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہت تہذیب یافتہ اور مہذب بھی تھا۔

”آپ نے مجھے بلوایا تھا باسط!“ اتنے دن ساتھ کام کرنے کی بنا پر تھوڑی بہت بے تکلفی تو پیدا ہو ہی چکی تھی کہ میں اسے نام سے پکارتی۔

”معذرت چاہتا ہوں کہ آپ کو زحمت ہوئی۔“ اس نے جھینپتے ہوئے کہا۔
”معذرت کی تو خیر کوئی بات نہیں لیکن میں غزل

انجوائے کر رہی تھی۔ پتا نہیں منی بیگم کو لائیو سننے کا موقع دوبارہ ملے نہ ملے۔“ میں نے خوشی دلی سے کہا تھا۔

”منی بیگم آپ کو بہت پسند ہے؟“
”بہت۔“ میں نے گرل بر بازو اٹکا کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس ان کا سارا کوئیکشن ہے آج آؤ گراف بھی لے کر جاؤں گی بائے واو۔“ مجھے یکدم خیال آیا۔

”آپ باہر کیوں کھڑے ہیں، اس قدر خوب صورت غزلیں گائی جا رہی ہیں اندر۔“
”بس یونہی۔“ وہ دو لفظی جواب دے کر سامنے دیکھنے لگا۔ مجھے اس کا کھویا کھویا سا انداز کچھ عجیب سا لگا تھا لیکن اس متعلق سوال کرنے کا خیال ترک کر کے میں نے پوچھا۔

”باسط! آپ نے مجھے کیوں بلوایا تھا؟“
اسی وقت وہ بیٹر کافی لے کر آگیا غالباً ”باسط نے پہلے سے آرڈر کی ہوئی تھی تب ہی ایک کپ مجھے پکڑا کر دو سرا خود لے لیا۔

”مجھے آپ سے کچھ بات کرنا تھی۔“
”جی کہیے۔“ تب باسط نے چند سیکنڈ سوچا پھر اپنے کوٹ کی جیب سے ایک خوب صورت مخملی ڈسہ نکالی اور کھول کر اسے عین میرے سامنے گرل کے فریم پر رکھ دیا۔

میں سمجھی اور نا سمجھی کی کیفیت میں کبھی اس خوب صورت ڈائمنڈ رنگ کو تو کبھی باسط ملک کو دیکھ رہی تھی جس کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی جبکہ آنکھوں میں پوری داستان۔

”میرا نہیں خیال اظہار محبت کا اس سے بہترین طریقہ کوئی اور ہو سکتا ہے۔“ باسط کے کھنکھتے لہجے نے جیسے مجھے ششدر کر کے رکھ دیا تھا۔

”صرف اظہار محبت ہی کیوں ہر پوز کرنے کے لیے بھی اس سے مناسب طریقہ اور کوئی نہیں ہو سکتا مگر شاید آپ کو کنوئس کرنے کے لیے مجھے لفظوں کا سہارا لینا پڑے گا۔ دیکھیے نور! میں بہت اسٹیٹ فارورڈ

آؤی ہوں چاند ستارے توڑ کر لانے والے جھوٹے وعدے نہیں کر سکتا لیکن ایک بات طے ہے اگر آپ میرا ساتھ قبول کرتی ہیں میں آپ کو ہر وہ خوشی دوں گا جسے لانا میرے بس میں ہوگا۔ پہلی بار آپ مجھے کب اچھی لگیں، یہ تو مجھے پتا نہیں لیکن۔“

”باسط پلیز۔۔۔“ میں نے بے ساختہ اس ٹوک دیا کہ اس کی باتوں نے محاورہ ”نہیں حقیقتاً“ میرے اوسان خطا کر دیے تھے۔ میرے تو وہ ہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ باسط نے مجھے یہ بات کرنے کے لیے بلایا ہوگا۔ میں نے محبت کا اختیار حسن کو دیا تھا دل و دماغ میں خود بخود یہ بات ثبت ہو چکی تھی کہ محبت کے اظہار کا حق بھی صرف حسن کو ہے۔

پریشانی کی ایک وجہ خود باسط بھی تھا نہ جانے اس بھلے انسان نے میرے کس انداز سے غلط امپریشن لیا تھا کہ میرے بارے میں اس طرح سوچنے لگا۔ مجھے سخت شرمندگی لاحق ہو رہی تھی۔ عجب کشمکش کا شکار تھی باسط نے میری خاموشی سے جانے کیا مطلب اخذ کیا کہ اس کے چہرے پر خجالت کی سرخی چھا گئی۔

”آئی ایم سوری نور! آپ کو برا۔۔۔“ میں نے ایک بار پھر اسے ٹوک دیا آن واحد میں میں فیصلہ کر چکی تھی کہ مجھے باسط کو حسن کے بارے میں بتا دینا چاہیے۔ پھر میں نے یہی کیا۔ بے حد مناسب الفاظ میں اسے اپنے اور حسن کے بارے میں بتا کر معذرت کرنی۔ باسط کو پہلے یقین نہیں آیا پھر اس کے لبوں پر پھسکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ بلکہ مسکراہٹ بھی کیا تھی، لگتا تھا زبردستی مسکرایا جا رہا ہو۔

”آپ نے پہلے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔“
”کبھی کوئی ایسا موقع آیا ہی نہیں باسط! کہ میں اپنے مہنگیتر کا ذکر کرتی۔ یقین کیجیے۔ مجھے ذرا اندازہ ہوتا کہ آپ اس سب پر سوچ سکتے ہیں تو۔۔۔ تو میں پہلے ہی بتا دیتی لیکن۔۔۔ میں بہت شرمندہ ہوں باسط۔“

”آپ کیوں شرمندہ ہو رہی ہیں۔ یہ تو میری قسمت تھی۔ سہر حال ایک بات ماننا پڑے گی۔ آپ کے حسن صاحب بہت خوش قسمت ہیں۔“ اپنی

پاسیت پر قابو پاتے ہوئے اس نے خوش دلی سے کہا تھا۔

میں نے اسے بغور دیکھا پھر اس انگوٹھی کو دیکھا جواب تک گرل پر رکھی ہوئی تھی۔

”آپ بہت اچھے انسان ہیں باسٹ! مجھے یقین ہے جو بھی لڑکی آپ کی زندگی میں آئے گی وہ بہت خوش قسمت ہوگی۔“ میں نے صدق دل سے کہا تھا۔ واپس جاتے ہوئے میں نے ایک مرتبہ مڑ کر دیکھا باسٹ ابھی تک اس انگوٹھی پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ میرے دل پر بوجھ سا آن کر اور یہ بوجھ اب یقیناً ”ساری زندگی رہنا تھا۔“

میں اتنی باحوصلہ نہیں تھی کہ کسی کادل توڑ کراتی جلدی مطمئن ہو بیٹھتی کئی دن اسی کشمکش میں گزر گئے۔ لیکن اس کے بعد میں نے اسٹوڈیو جانا چھوڑ دیا۔ میں دوبارہ باسٹ سے کبھی نہیں ملنا چاہتی تھی۔

مجھے پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ اتنے زیادہ خواب نہیں دیکھنا چاہئیں کیونکہ پھر حقیقت پر بھی خواب کا گمان ہونے لگتا ہے جیسے کہ مجھے لگ رہا تھا۔

حسن میری گاڑی میں میرے ساتھ موجود تھا اور مجھے بار بار خواب کا گمان ہو رہا تھا۔

لیکن یہ خواب نہیں تھا۔ حسن میرے ساتھ موجود تھا۔ ایک اٹل اور میری زندگی کی سب سے خوش کن حقیقت کی طرح۔

یہ میری زندگی کا سب سے بہترین دن تھا۔ حسن کی خواہش تھی کہ اسے ریسیو کرنے کے لیے میں آؤں دل سے میں بھی یہی چاہ رہی تھی لیکن خود سے کچھ کہنا بھی مناسب نہیں لگ رہا تھا، پہلی بار میرا دل چاہ رہا تھا کہ کاش میں منگیتر کے بجائے حسن کی بیوی ہوتی۔

اچھی بات یہ ہوئی کہ ”تپاؤں“ نے مجھے بخوشی حسن کو ریسیو کرنے جانے کی اجازت دی تھی میں خوش ہوئی لیکن بچہ پارٹی مایوس ہو گئی تھی وہ سب شاید

حسن سے ملنے کے لیے مجھ سے بھی زیادہ پر جوش تھے کیونکہ ان میں سے اکثر اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے جب حسن ملک سے باہر گیا۔ میں نے ناچار بچوں کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی لیکن چودہ سے سولہ سال کے ایچ گروپ کے یہ بچے اتنے عقل مند تو تھے کہ کپل کے درمیان ہڈی بننے سے گریز کریں۔ سوسب نے میرے سر پر احسان جتاتے ہوئے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔

حسن کی آمد سے پہلے کا پورا ایک دن میں نے پارلر میں گزارا تھا۔ فیشنل ڈسکسنگ یعنی کیور پیڈی کیور ٹیما ہیر کٹ یعنی اس روز جب میں پارلر سے نکلی تو بقول نعل خوب چمک رہی تھی۔ اگلے روز میں نے ”تن زیب“ سے خریدا ہوا حسن کی پسند کے رنگ کا ریڈی میڈ سوٹ پہنا ہلکا سا میک اپ کیا اور بال بھی خوب اچھے طریقے سے سیٹ کیے۔ اور جب میں آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تو سچ بات ہے کہ مجھے خود بھی جھجک محسوس ہونے لگی۔

میں حسن کی منگیتر تھی نہ بیوی ہم فقط محبت کی ڈور میں بندھے ہوئے تھے اور اسی تعلق نے مجھے حسن کا پابند بنے رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں خوش لباس خوش اطوار تھی لیکن بننے سنورنے سے گریز کرتی۔

اور اب حسن آ رہا تھا تو میں بہت دل سے تیار ہوئی تھی۔

سترہ سال پہلے کے حسن اور نور کی شخصیات میں آج کے حسن اور نور کے پر عکس بہت فرق آچکا تھا نہ میں سولہ سال کی نور رہی تھی نہ وہ انیس سال کا حسن لیکن آمنے سامنے آتے ہی ہمیں لمحہ بھی نہیں لگا ایک دوسرے کو پہچاننے میں۔

میں اور حسن سترہ سال بعد ایک دوسرے کو کیسے دیکھ رہے تھے۔ تو اس کا جواب محض یہ ہے کہ یہ حسن کی خواہش تھی اس نے کبھی اپنی تصویر بھجوائی نہ میری مانگی۔

وہ کہتا تھا ”تصویر آدمی ملاقات ہوتی ہے اور ادھوری ملاقاتیں تشنگی بڑھاتی ہیں گھٹاتی نہیں“

تہناری تصویر تو دل میں بسا کر لایا تھا جب دل کرتا ہے آنکھیں بند کر کے دیکھ لیتا ہوں۔“ کبھی وہ موڈ میں ہوتا تو ایسے ڈانٹا لگتا تھا اور مجھے اس کی ہر بات پر بنا بحث سر جھکا دینے کی عادت سی ہو گئی تھی۔

ہم بنا پلکیں جھپکے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ایرپورٹ کی عمارت معا ”معدوم“ ہو گئی۔ آس پاس سے گزرتے لوگ دھند کا ایک جھونکا بن کر گزرنے لگے۔

وہاں صرف میں تھی اور وہ۔۔۔ وہ حسن میرا سب کچھ۔۔۔ میری محبت۔۔۔ دنیا میں میرا کل۔ میں نے سترہ سال اس کا انتظار کیا تھا۔ میرے ہاتھ جب بھی دعا کے لیے اٹھتے پہلے اور آخری دعا حسن کے نام کی ہوتی۔ میں اس کے مصائب ٹل جانے کی منتیں مانتی تھی۔ وہ میری محبت تھا، نہیں وہ میرا عشق تھا، میرا دیوتا تھا، میرا سائیں تھا، وہ میرا سب کچھ تھا۔ سب کچھ۔

میں اسے سترہ سال بعد دیکھ رہی تھی یا شاید میں اسے پہلی بار دیکھ رہی تھی کیونکہ جب وہ جا رہا تھا میں نے تب بھی اسے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ اس شام جب سورج غروب ہونے کا وقت تھا اور حسن اس رخ سے کھڑا تھا کہ اس کے عقب سے نکل نکل کر اس معدوم ہوتے سورج کی تیز کرنیں میری آنکھوں میں گھس گئی تھیں۔ جب آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو وہ محبت کا تاثر چھوڑ کر جا چکا تھا۔ وہ میری تصویر دل میں بسا کر لے گیا تھا مگر میرے دل میں اس کی تصویر نہیں تھی صرف اس کا ”تصور“ تھا۔ میں اسی تصور کی محبت میں مبتلا تھی۔

اور میرا تصور جسم ہو کر میرے سامنے کھڑا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو بننے لگے اور مجھے بتا بھی نہ پہل سکا یہ آنسو کب میرا چہرہ بھگوتے چلے گئے۔ بتا نہیں یہ خوشی کے آنسو تھے یا اس کے بغیر گزارے ان سترہ سالوں پر محیط صبر آزمائی کی تکلیف کے۔

میں نے حسن کے چہرے پر مسکراہٹ کی کرنوں کو پہلے دیکھا پھر وہ چند قدم چل کر میرے قریب آیا اور ”دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے میرے آنسو پونچھ

ڈالے۔ میں نے آنکھیں موند کر اپنی پیشانی اس کے کندھے سے لگا دی اور اس درد کو آنکھوں سے بہہ جانے دیا جو اسے سامنے پا کر دل کی سرزمین پر پھیل رہا تھا۔

حسن کے دونوں ہاتھ مجھے محبت سے سمیٹے ہوئے تھے میں اس کا لمس محسوس کر سکتی تھی۔ وہ ایک حصار تھا جس کے دائرے نے مجھے محفوظ کر دیا تھا۔

مجھے ارد گرد کی پروا نہیں تھی مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ لوگ ہمیں دیکھ رہے ہوں گے۔ اشارے کر رہے ہوں گے مگر میں کسی سے خائف نہ تھی حسن میرا آدم تھا اور میں اس کی حوا۔۔۔ میں اس کی پسلی سے تخلیق ہوئی تھی۔ جنت میں ہم اکٹھے رہتے تھے۔ پھر شرم لاج کیسی؟ خوف کس کا؟ دنیا کا؟ والوں کا؟

”ارے لوگو! یہ میرا جنت کا ساتھ ہے اور جب یہ میرے ساتھ ہے تو دنیا ہی میری جنت ہے۔“ میری روح خوشی و سرشاری سے جیسے دیوانی ہوئی جاتی تھی۔ تب ہی کسی منہ چلنے نے سیٹی بجائی۔ میں سٹپٹا کر حسن سے دور ہو گئی۔ حیا سے لال پڑ گئی میری روح بھول گئی تھی یہ دنیا ہے اور دنیا جنت کا پڑاؤ ہو سکتی ہے مگر جنت کبھی نہیں ہو سکتی۔ روح تو اپنے ازل سے انہی کے سینے سے پیشانی نکالے اپنی تنہائی کے دن یاد کرتی تھی زمانہ نچانے کیا سمجھا۔

میں نے کہیں قریب سے خود پر قہقہے لپکتے محسوس کیے تھے۔ خفت سے سر جھکا کا جھکارہ گیا۔

”تم بالکل نہیں بدلی ہو نور! بالکل ویسے کی ویسی ہو“ جیسی سترہ سال پہلے تھی۔ چھوٹی سی بچی۔ اس نے کھنکھتے لہجے میں میرے آنسوؤں کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا۔

میں روتے ہوئے مسکرا دی۔

”سترہ سال پہلے میری بصارت تو شاید یہیں رہ گئی تھی آج تمہیں دیکھ کر میری آنکھوں کی تسکین ہوئی ہے۔“

میں نے سر اٹھا کر دیکھا حسن کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ جذب سے بول رہا تھا اور اس کی والمانہ نظریں میرے چہرے کے ایک ایک نقش کو جذب کر رہی تھیں میں نے فوراً پلکیں جھکا لیں۔ لیکن لرزتی پلکوں کے باوجود میں اپنی بے ساختہ مسکراہٹ روک نہیں پائی پھر مسکراہٹ بے ساختہ ہنسی میں بدل گئی۔ وہ شخص جس کی محبت میں آپ پور پور ڈوبے ہوں اس کے منہ سے ایسی باتیں سن کر کیسا لگتا ہے۔

محبوب کا اظہار اس کا والمانہ پن۔ وہ اسم ہوتا ہے جو عورت کے وجود کو روٹی کے گالے میں ڈھال دیتا ہے اور عورت تفکرات زمانہ سے آزاد ہو کر ہلکی پھلکی ہو کر ہوا میں اڑنے لگتی ہے۔ بارش کی ہنسی ان چھوٹی بوندیں کر فضا میں تیرنے لگتی ہے۔ پانی کی نازک لہریں کر بننے لگتی ہے اور یہ ایک ایسا دلفریب احساس ہوتا ہے جس کا کوئی نعم البدل ہو ہی نہیں سکتا۔

حسن میری ہنسی میں شامل تھا وہ میرے ہر جذبے میرے ہر احساس میں برابر کا شریک تھا۔ میں زیادے کی نظروں سے خائف ہو کر اس سے دور رہتی تھی لیکن اسے زمانے کی پروا نہیں تھی وہ دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے دل کی ماننے پر یقین رکھتا تھا۔ تب ہی اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور دوسرے ہاتھ سے ٹرائی دھکیلتے ہوئے ہم ایئر پورٹ کی عمارت سے باہر آ گئے۔

روڈ کراس کرتے ہوئے میں نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میں سچ سچ چھوٹی سی بچی بن گئی تھی۔

اور اب ہم ساتھ ساتھ تھے اور میں گردن موڑ موڑ کر اسے دیکھ رہی تھی۔ میرے سیل فون پر بار بار منیڈہ آپا کے گھر سے کسی نہ کسی کی کال آرہی تھی وہ سب حسن سے رابطہ کرنے کے لیے بے چین تھے۔ تنگ آ کر حسن نے ڈیش بورڈ سے سیل فون اٹھا کر آف کر دیا۔

”گیا کر رہے ہو حسن! گھر میں سب پریشان

ہو جائیں گے۔ ایک بار اینڈ کر کے کہہ دو۔ ہم بس رہے ہیں۔“ میں نے جلدی سے اسے فون آف کرنے سے روکتے ہوئے کہا۔

”کتنی مرتبہ؟“ حسن نے کہا۔

”پندرہ مرتبہ تم کہہ چکی ہو سو لو میں مرتبہ میں یہی بات کہوں گا تو کسی اور کا فون آنے لگے گا اس۔“

اب جو بھی بات ہوگی گھر پہنچ کر ہی ہوگی۔“ اس نے سیل فون واپس ڈیش بورڈ پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

”اور تم ایک کام کرو گاڑی سائیڈ پر روک کر مجھے بھر کر دیکھ لو تاکہ تمہیں بار بار میری طرف نہ دیکھ پڑے۔ گھر آرام سے چلے جائیں گے۔“

اس نے یک دم میری چوری پکڑتے ہوئے کہا تھا میں بری طرح جھینپ گئی حسن نے قہقہہ لگایا پھر ریلیکس انداز میں بازو پھیلاتے ہوئے کہنے لگا۔

”پاکستان آکر بہت اچھا لگ رہا ہے۔“

”گھر والوں سے مل کر اور بھی اچھا لگے گا۔“ میں نے کہا تو وہ گردن گھما کر میری طرف دیکھنے لگا۔

”لیکن جتنا اچھا تم سے مل کر لگا ہے۔ اتنا اچھا کسی اور سے مل کر نہیں لگے گا۔“ اس بات کا جواب میرے پاس نہیں تھا حسب معمول مسکراتے ہوئے میں ایک موڑ احتیاط سے کاٹنے لگی۔ ہم منیڈہ آپا کے گھر سے کچھ ہی دور تھے۔ لیکن مجھے اپنے چہرے پر حسن کی نظریں مستقل محسوس ہو رہی تھیں وہ اطمینان سے کچھ ترچھا ہو کر بیٹھا مجھے دیکھ رہا تھا۔

”اس طرح کیا دیکھ رہے ہو حسن۔“ میں نے اپنے گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔

”میں دراصل تم کو دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں۔“ حسن نے پھر کہا۔

”چند سالوں میں انسان میں تبدیلی آ جاتی ہے لیکن تم کو دیکھ کر مجھے لگ رہا ہے میں سترہ سال پہلے والی نور کو ہی دیکھ رہا ہوں۔ صرف تمہارے بال لمبے ہوئے ہیں اور قد لمبا ہوا ہے ورنہ تم بالکل ویسی ہی ہو جیسی میں چھوڑ کر گیا تھا۔ اتنی ہی انوسینس (معصوم) اتنی

گریس فل کاش میں اپنی آنکھوں سے دکھا سکتا۔“ پھر کچھ خیال آنے پر اس نے پہلو بدلتے ہوئے ایب سے والٹ نکالا اور والٹ کھول کر میرے سامنے کر دیا۔ اس کے والٹ میں میری تصویر لگی ہوئی تھی اس میں میں ہنس رہی تھی اور میری آنکھوں میں پانی لہر رہا تھا تصویر میں میرے بال کندھوں تک آ رہے تھے۔ مجھے یاد آیا میٹرک تک میرے یہی ہیرکٹ ہونا نا۔

”یہ تصویر تمہارے پاس کہاں سے آئی؟“

”تمہیں یاد ہے نا ننھے کلاس میں اچھے مار کس لینے تم نے اپنی فرینڈز کو پاپائی دی تھی۔ تب ہی میں نے ہمپ کر یہ تصویر کھینچی تھی۔“ والٹ میں لگی تصویر کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے حسن نے فخریہ انداز میں اپنا کارنامہ بتایا۔

”تم میری تصویر ساتھ لے گئے تھے۔“ میں نے ناراضی سے کہا۔ ”میرے پاس تمہاری ایک بھی تصویر نہیں تھی حسن!“

”بھئی تم تو اس وقت بھی اتنی خوب صورت تھیں اب بھی اتنی ہی خوب صورت ہو لیکن میں تو تب لم اھنگ سا ہوتا تھا۔ اگر تب ہی اپنی تصویریں دکھاتا رہتا تو کبھی مجھ سے محبت نہ ہوتی تمہیں۔ اب دیکھو میں کتنا ہینڈ سم ہو گیا ہوں۔ تصویر کے بجائے تم مجھے لیس ٹوفیس دیکھ لو اور خود پر فخر کرو کہ کتنے شاندار ہینڈ سم ندے سے محبت ہوئی ہے تمہیں۔“ اس نے نیم

بجیدگی سے اتراتے ہوئے کہا تھا۔

”زیادہ ہی خود پسند نہیں ہو گے تم۔“ میں نے اسے چڑایا۔ ”کس نے غلط فہمی میں ڈال دیا کہ تم ہینڈ سم ہو؟“

”جب سے آیا ہوں کسی کی آنکھیں مستقل مجھے تار رہی ہیں اس سے بڑی گواہی اور کیا ہوگی مگر تمہیں! حسن نے شرپر لہجے میں کہا تھا۔

”ابھی جب گھر جائیں گے تو دیکھنا آپائیں کیسے میری بلا میں لیتی ہیں۔“

منیڈہ آپا کی طرف سب آئے ہوں گے؟“ یکدم

کچھ خیال آنے پر اس نے پوچھا۔

”ہاں تقریباً۔“ میں اسے سب کے متعلق بتانے لگی اور یہ بھی اگلے کچھ روز تک اسے کس کس نے اپنے یہاں انوائیٹ کر رکھا ہے ان میں سر فرسٹ فاروق بھائی جان تھے جنہوں نے کل ہی اپنی طرف اس کے لیے رچ رکھا تھا۔

”کل۔۔۔؟“ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”کل اگر فاروق بھائی کی طرف جانا ہے تو مکان دیکھنے کب جائیں گے تم نے پراپرٹی ڈیلر سے تو بات کی ہے نا؟“

”پراپرٹی ڈیلر سے تو بات کی ہے لیکن مکان دیکھنے کی اتنی جلدی کیا ہے۔ دو چار روز آرام کر لو سب سے مل لو پھر اطمینان سے مکان دیکھ لیتا۔“

”اور اتنے دن کیا منیڈہ آپا کی طرف رہوں؟ نہیں یار! بہنوں کے گھر بھائی رہتے اچھے نہیں لگتے۔ دو ایک روز میں گھر لے لوں پھر اطمینان سے شادی کی تیاریاں شروع کر سں گے۔“

شادی کا لفظ سن کر میری مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی میرا دل چاہا حسن سے کہوں آخر نیا گھر خریدنے کی کیا ضرورت ہے۔ شادی کے بعد وہ میرے گھر میں شفٹ ہو سکتا تھا۔ جو میرا تھا وہ اسی کا تھا لیکن ایک بار پہلے بھی ایسی بات اشارتا کر کے میں اس کی خفگی برداشت کر چکی تھی اس لیے اس بات کو کسی اور وقت پر ٹال دیا۔

ہم منیڈہ آپا کے گھر پہنچے تو وہاں سب لوگ جمع تھے حسن کے استقبال کے لیے۔ حسن کی چاروں بہنیں، ان کے شوہر اور بچوں کے علاوہ میرے بہن بھائی، بھابھیاں اور بہنوں کے ساتھ بواجی شارقہ خالہ بھی موجود تھیں۔

اتنے افراد کو ایک ساتھ دیکھ کر حسن تھوڑا سا سٹپٹا گیا۔

”سارا خاندان ہی جمع ہے ایک قاضی کا بندوبست بھی کر لیتے تو یہ معاملہ بھی نبٹ جاتا پھر ولیمہ کی تقریب کے لیے ہی خرچا کرنا پڑتا۔“ اس نے سنجیدہ انداز میں شرارت سے کہا تھا۔ میں فقط مسکرا دی۔

137 جون 2011

جاؤ۔ اتنی چھٹیاں کرو گی تو ملازمت مستقل ہونا تو دور بات تمہارا کانٹریکٹ Extand (مدت میں توسیع) بھی نہیں کیا جائے گا۔“

”میں کیا کروں نویر! ہر دوسرے تیسرے روز تو والد صاحبہ کے مہمان آتے رہتے ہیں ان کی خدمتیں کروں تو والد صاحب خفا ہو جاتے ہیں۔ مجبوراً“ مجھے چھٹی کرنا پڑتی ہے۔ اب دیکھو ان لائق صاحبہ کو شاپنگ بھی میرے سر منڈھ دی ہے۔“ اس نے بے زاری سے کہا۔

”لائق کون؟“

”سو تیلی والدہ ماجدہ کے بھائی صاحبہ۔“ سو تیلی ماں کے بارے میں وہ ہمیشہ اسی طرح طنز سے بات کرتی تھی۔

”افریقہ سے آئے ہیں اور جب سے آئے ہیں ہمارے گھر ڈیرا ڈالے بیٹھے ہیں۔ کسی دوست کی شادی میں جانا ہے اور مجھے حکم ملا ہے کہ ساتھ جا کر اچھا گفت خریدوں کیونکہ لائق صاحبہ کو ایسی شاپنگ کوئی تجربہ نہیں۔“

”تم نے کب سے حکم ماننے شروع کر دیے۔“ میں نے کسی قدر تعجب سے کہا لیکن نمل ہال کی انٹرس طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

”وہ دیکھو۔ لائق ابھی گیا۔ میں چلتی ہوں۔“

میں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا ایک اونچا لمبا ڈل ایجنڈ آدمی چلا آ رہا تھا۔ شکل و صورت صحت واجبی لیکن سوٹ قیمتی پن رکھتا تھا ہاتھ میں مہنگا موبائل اور کلائی پر بیش قیمت گھڑی۔ جس کے ڈائل کی چمک اتنی دور سے بھی محسوس ہوتی تھی۔

”اس کی تو اچھی خاصی عمر لگ رہی ہے نمل! ماموں نہیں تو کم سے کم بھائی ہی کہہ لیا کرو۔“

میری بات سن کر نمل نے اپنے ہی ہاتھ پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگایا۔

”یہ بڑا دلچسپ قصہ ہے یار! یہ محترم اپنی عمر کے معاملے میں عورتوں سے بھی زیادہ کانٹیشنس رہتے ہیں۔ شروع شروع میں زینب اور تحریم کی تقلید

”ایک بات تو بتاؤ نویر! تم پہلے بھی خوب صورت تھی یا حسن کی آمد کا اثر ہے کہ خوشی کے مارے تمہارے چہرے پر نور جھلکنے لگا ہے؟“

میں منیجر صاحبہ کے آفس سے نکل کر اپنے کیبن میں آئی ہی تھی کہ نمل نے اپنی کرسی سے اٹھ کر میری طرف آتے ہوئے پوچھا۔ اس کا سوال سن کر میں خوش دلی سے مسکراتے لگی۔ نور کا توپتا نہیں لیکن بات بے بات مسکراہٹ ضرور میرے چہرے پر جھلک رہی تھی۔ نمل مجھے مسکراتا دیکھ کر حسن کے متعلق پوچھنے لگی وہ کیسا لگ رہا تھا؟ تم سے کیسے ملا؟ کیا کیا باتیں ہوئیں؟ تمہارے لیے کیا لایا ہے وغیرہ۔

”میرا کل ہی بہت دل چاہ رہا تھا کہ حسن سے ملوں بڑا تجسس تھا کہ ان محترم کو دیکھوں جن کے اتنے قصے سنے ہیں۔ لیکن کل اتنی ٹھکن ہو گئی تھی کہ دوبارہ گھر سے نکلنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔“

”ہاں تو تم اب میرے ساتھ چلو فاروق بھائی کی طرف حسن اور اس کی بہنوں کی فیملی کی دعوت ہے۔ آذر کو بھی بھائی جان نے انوائٹ کیا ہوا ہے۔ حسن کو بھی دیکھ لینا آذر سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔“ میں نے فٹ دعوت دے ڈالی۔

”نہیں نویر! آج نہیں جاسکتی۔ آذر کا ارادہ ہے حسن کو اور تمہیں کسی روز ڈنر پر لے جانے کا۔ اور ظاہر ہے یہ ڈنر میرے بغیر مکمل تھوڑا ہی ہوگا۔ حسن سے اس روز مل لوں گی۔ ابھی تھوڑی دیر میں لائق بھی آنے والے ہیں مجھے ان کے ساتھ شاپنگ کے لیے جانا ہے۔“

”تم پھر کہیں جا رہی ہو؟“ ابھی میں منیجر صاحبہ سے ہاف لیو کا پوچھنے گئی تو وہ کہہ رہے تھے۔ ”نمل بابی تو پھر دوسرے تیسرے ہاف لیو لیتی رہتی ہیں۔ آپ کیوں اتنا جھجک رہی ہیں لیو لیتے ہوئے۔“ مجھے اچانک یاد آیا تو میں ایسے سمجھانے لگی۔

”نمل اس طرح تو تم اس جاب کو بھول ہی

میں میں نے بھی ماموں کہہ دیا تو پاگل آدمی رونے بیٹھ گیا۔ اپنی بہن کے سامنے کہہ کیا میں اتنا بڑا لگتا ہوں کہ نمل کی عمر کی لڑکیاں مجھے ماموں کہیں۔ اماں جی نے فساد ڈال دیا کہ نمل نے جان بوجھ کر میرے بھائی کا دل دکھایا ہے۔ دل تو میرا چاہا کہ نیلن سے دونوں بہن بھائی کی اتنی پٹائی کروں کہ صرف دل نہ دکھیں۔ پورے کے پورے دکھیں مگر بابا کے خوف آڑے آ رہا تھا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ میں بھائی کہہ لوں گی اس پر جناب منہ بسور کر بولے۔ آپ مجھے لیتے ہی کہہ لیا کریں۔ ویسے بھی خوب صورت لڑکیوں کے منہ سے مجھے اپنا نام سننا اچھا لگتا ہے۔ نمل تو ہنس ہنس کر بتاتی رہی۔ میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”بی کیئر فل نمل! مجھے تو یہ بندہ بہت عاشق مزاج لگ رہا ہے۔“

”ارے ایسا ویسا۔“ نمل پھر چمکی۔ ”کبھی کبھی تو مجھے کہتا ہے نمل پلیز میرا نام لیجیے نا آپ کے منہ سے اپنا نام سننا مجھے سعادت لگتا ہے۔“

اس نے چہرے پر ہاتھ رکھ کر ڈرامائی سے انداز میں کہا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں بھی ہنسنے لگی۔

”تم نے آذر کو بتایا ان کے متعلق؟“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”لیکن میرا خیال ہے مجھے آذر کو خبردار کر دینا چاہیے۔“ میں نے شرارتاً کہا۔

”خدا کو مانویا! نمل نے بے ساختہ ہاتھ جوڑ کر اور آواز دبا کر کہا کہ وہ بندہ قریب آ گیا تھا۔“

”آذر کو دیکھو اور اس کو دیکھو۔ کیا یہ آدمی اس قابل ہے کہ اسے آذر پر فوقیت دی جائے۔ یہ تو ایسا بھی نہیں ہے کہ اس کا موازنہ آذر سے کیا جائے۔“

اس نے ناگواری سے کہا پھر مجھے اللہ حافظ کہتی اپنے نیبل کی طرف چلی گئی اور چیزیں سمیٹنے لگی میں نے دور سے دیکھا لیتے بہت لجاجت بھرے انداز میں نمل سے باتیں کر رہا تھا۔

☆☆☆

آفس سے سیدھی میں فاروق بھائی جان کی طرف

آئی تھی۔ حسن سمیت سب مہمان آچکے تھے صرف میرا انتظار تھا دیر سے پہنچنے پر سب ہی نے حتی المقدور میری کھینچائی کی۔ ماریہ بھابھی تو فنانٹ کھانا لگانے کی غرض سے کچن میں چلی گئیں۔

میں فردا فردا سب سے ملنے لگی تب ہی میری نظر حسن پر پڑی۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش دلی سے مسکرایا اور منیڈہ آپا کی طرف جھک کر ان کے کان میں کوئی بات کہی۔ منیڈہ آپا فلک کی کسی بات پر ہنس رہی تھیں۔ حسن کی بات سن کر ان کے تاثرات یک دم بدل گئے مجھے یوں لگا جیسے وہ پریشان ہو گئی ہوں۔

میں سب سے ملنے ہوئے ان کی طرف آئی۔ ”کیا بات ہے منیڈہ آپا! آپ پریشان لگ رہی ہیں؟“ میں ان کا حال احوال دریافت کرنے کے بعد خود کو پوچھنے سے روک نہیں سکی۔

”نہیں پریشانی کیسی؟“ انہوں نے جلدی سے کہا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھے ٹال رہی ہوں لیکن اس متعلق کوئی سوال کرنا مناسب نہیں تھا سو میں خاموش رہی۔

”اور یہ تم نے اپنا حال کیا بنا رکھا ہے۔ میں تو اتنے دن بعد مل رہی ہوں دیکھ کر حیران رہ گئی کتنی کمزور ہو گئی ہو۔“ آپا نے فکر مندی سے کہا تھا۔ میں ہنس دی کیونکہ میں آپا کو ہمیشہ کمزور ہی لگتی تھی۔

”آپ مجھے اتنی محبت والی نظروں سے نہ دیکھا کریں آپا! یہ آپ کی محبت ہے کہ میں آپ کو ہر بار دہلی لگتی ہوں۔“

”تو اپنا خیال بھی تو تم نہیں رکھتیں میری جان! ناٹن ٹو فائو والی چاب آسان تو نہیں ہولی مروت تک تھک جاتے ہیں تم تو پھر نازک سی لڑکی ہو۔ بس اب حسن آگیا ہے فوراً“ سے پیشتر استغنی دو اور اپنا گھریا ر سنبھالنے کی کرو۔“ انہوں نے دھونس بھرے انداز میں کہا تھا۔

میں ان کی محبت بھری ناراضی پر مسکرا رہی تھی۔ تب ہی عفیوہ آئی اور عجلت میں مجھے کھینچتی ہوئی اپنے کمرے میں لے گئی۔

”کیا کر رہی ہو عفیوہ! مجھے منیڈہ آپا سے بات تو کرنے دیتیں۔“ میں نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

”اب ساری زندگی آپ نے ان سے باتیں ہی کرنا ہیں۔ اپنی بڑی نند صاحبہ کو

Buttering (خوشامد) پھر کسی وقت کر لیجیے گا“ فی الحال میری بات سن لیں۔“ اس نے مجھے چڑاتے ہوئے کہا۔ میں نے اسے گھور کر دیکھا پھر بازو باندھتے ہوئے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ وہ میرا نظر سمجھی یا نہیں، لیکن کمر پر دونوں ہاتھ رکھے اپنی چمکتی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی اور مسکراتی رہی، پھر یک دم بائیں پھیلا کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اس نے مجھے اتنی زور سے لپٹایا کہ میری چیخ نکل گئی اور میں گھبرا بھی گئی۔

”کیا کر رہی ہو عفی! میں نے بے ساختہ کہا۔“ میں آپ کے لیے بہت خوش ہوں نویر! بہت بہت خوش۔“ اس نے الگ ہوتے ہوئے پر جوش اور کھنک دار لہجے میں کہا۔

”آپ نے حسن انکل کو دیکھا ہے؟ مجھے آپ کی قسمت پر رشک آ رہا ہے۔ جب تک حسن انکل کو دیکھا نہیں تھا، ان سے ملی نہیں تھی، مجھے خدشہ ہی رہتا تھا کہ وہ کوئی اونگے بونگے (معمولی) سے انسان ہوں، کیونکہ آپ خود اتنی اچھی ہیں کہ کوئی آپ کو برا ہی نہیں لگتا۔ میں سوچتی تھی جو انسان آپ کا شریک حیات ہے اسے بھی اتنا ہی بہترین ہونا چاہیے اور حسن انکل اتنے اچھے ہیں، حقیقت میں وہ آپ کا پرفیکٹ میچ ہیں۔“

وہ خوشی سے بولتی، پھر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں اس کے جوش اور دیوانگی نیا خوشی پر حیران بھی تھی اور مسرور بھی۔ حسن کی تعریف میری تعریف تھی اور حسن مجھے دنیا میں سب سے عزیز تھا۔

”اچھا اب ہٹو۔ میں ماریہ بھابھی سے پوچھ لوں کوئی کام ہو تو بتا دیں ورنہ بعد میں شکوہ کریں گی کہ میری وجہ سے اتنے لوگوں کا کھانا کیا اور میں نے کسی کام کے لیے بھی نہیں پوچھا۔“ میں نے شرارتی انداز میں کہا۔

میں کہا۔

عفیوہ اپنی چمک دار آنکھیں پھیلا کر بولی۔

”آپ میری می کو کتنی اچھی طرح جانتی ہیں نویر!“ پھر ہم دونوں ہنس دیے، لیکن آج ماریہ بھابھی کے انداز ہی بدلے ہوئے تھے۔ وہ بڑی خوش دلی سے مہمان نوازی کا فریضہ نبھا رہی تھیں اور دلچسپ بات یہ کہ انہوں نے ایک بار بھی کوئی کڑوی کسمیلی بات مجھے نہیں بتائی تھی۔

زیادہ افراد ہونے کی وجہ سے بھابھی نے ڈانگنگ نیبل کا تکلف نہیں برتا تھا، بلکہ ڈانگنگ ہال کو خالی کروا کر وہاں فرش نشست کا اہتمام کر لیا تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ گاؤتکیے رکھے گئے تھے اور درمیان میں دسترخوان کی چوکی تھی ہال کو عرب طرز پر سجانے کے بعد کھانا بھی اسی انداز میں یعنی بڑے بڑے تھالوں اور پیالیوں میں پیش کیا گیا تھا اور سارا مہینو بھی انہوں نے عرب طرز معاشرت کو مد نظر رکھتے ہوئے تیار کیا تھا۔

ماریہ بھابھی ان معاملات میں بہت سوجھ بوجھ رکھتی تھیں، کھانے کے بعد جب چاندی کی چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں قہوہ سرو کیا گیا تو سب ہی نے بھابھی کو بے حد سراہا۔

”بھابی سارا کریڈٹ حسن اور نویر کو جاتا ہے۔ آخر آج کا لچ اپنی دونوں کی وجہ سے ارج کیا گیا ہے۔“ ماریہ بھابھی نے خوش دلی سے مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کسی کی بات کے جواب میں کہا تھا۔

میں ان کی بات پر جتنا بھی حیران ہوتی کم تھا۔ وہ مجھے بالکل بدلی ہوئی ماریہ بھابھی لگ رہی تھیں۔ ممکن ہے حسن کی آمد نے ان کے اعتراضات کا قلع قمع کر دیا ہو اور اپنے پچھلے رویوں کی تلافی کے لیے وہ اتنی اچھی بن رہی ہوں۔ مجھے کئی طرح کے خیال آرہے تھے۔

خاموشی سے ایک ایک کے چہرے پر تشکر کی نظریں ڈالتے ہوئے میں چونکی۔ صرف وہ چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا جو میری خوشیوں میں برابر کا حصہ دار تھا۔ حسن پتا نہیں کہاں غائب ہو گیا تھا۔

میں چپکے سے سب کے درمیان سے اٹھی اور حسن کو تلاش کرتی باہر آگئی۔ اندر کے شور کے مقابلے میں باہر بے حد سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ آسمان سے شام کے رنگ جھڑپے تھے اور ان جھڑپے رنگوں میں لان کے بیچ و بیچ نصب فوارہ چپ چاپ کھڑا تھا لیکن اس کے دامن میں پانی کا عکس دکھائی دیتا تھا۔
ہوا چپکے چپکے بہہ رہی تھی۔

میں نے دیکھا برآمدے کی سیڑھیوں پر حسن سر جھکائے چند ناکی شاخ سے پتے توڑ توڑ کر نیچے پھینک رہا تھا۔ شاید کسی گہری سوچ میں تھا اور بے دھیانی میں پتے نوچ رہا تھا۔ میں نے گلا کھنکار کر متوجہ کیا تو بنا چوٹے گردن گھما کر مجھے دیکھنے لگا۔
”آؤ نور۔“

”کیا بات ہے حسن! تم باہر کیوں بیٹھے ہو؟“ میں نے سیڑھیاں اتر کر اس کے سامنے آتے ہوئے پوچھا۔ یوں کہ میرے عقب میں فوارہ تھا اور سامنے حسن جبکہ حسن کی پشت پر برآمدے میں وہ دروازہ کھلتا تھا جس سے میں باہر آئی تھی۔

”بس یوں ہی باہر آکر بیٹھ گیا۔ اندر اتنی گید رنگ میں میرا دل گھبرا رہا تھا۔“ اس نے بے زاری سے کہتے ہوئے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا یوں جیسے اپنے تاثرات مٹانا چاہ رہا ہو۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے حسن۔“ میں نے تشویش سے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ طبیعت ٹھیک ہے۔“ حسن نے سابقہ انداز میں کہا، پھر دوبارہ سے ہاتھ میں پکڑی شاخ کے پتے تو پھینکے۔

”کل جب میں نے تمہیں دیکھا تو میرے دل میں خود بخود یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ جس طرح سترہ سال تم پر اپنا اثر چھوڑے بغیر گزر گئے ہیں اس طرح باقی سب کے قریب سے بھی وہ بے قدموں گزر گئے ہوں گے۔ لیکن میں غلط تھا۔ سترہ سالوں نے تو میرا بہت نقصان

کروا کر گزرے ہیں۔ امی گزر گئیں آخری وقت میں میں ان کا چہرہ بھی نہیں دیکھ پایا۔ کل سارا دن میں ان کو یاد کرتا رہا اور آج یہاں آکر نیا ابو اور نائی امی یاد آ رہے ہیں۔ میرے قیمتی لوگ یہ سترہ سال لے اڑے۔ پتا نہیں کچھ خیالات کیسے خود بخود اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔“

میں نے برہم کر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔
”نہیں سب کچھ تو نہیں بدلا۔ کل تم نے خود ہی کہا تھا نور! تم بالکل نہیں بدلی۔ کیوں؟ کیا نہیں کہا تھا؟“ میں نے مسکرا کر کہا۔ جواباً حسن نے سر اٹھا کر بغور مجھے دیکھا۔ وہ چند لمحے مجھے اسی طرح دیکھتا رہا، پھر پھینکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بے دار ہو گئی۔

”ہاں۔۔۔ تم نہیں بدلیں۔“ اس کا لہجہ بھی بے حد پھیکا تھا، میں نے بڑی شدت سے اس کی اداسی و غمگینی کو محسوس کیا تو اس کا ہاتھ تھپتھا کر پیچھے ہٹ گئی۔

”تم بچوں سے ملے؟“ فوارے کی دیوار سے کمر دکاتے ہوئے میں نے موضوع بدلنے کی غرض سے پوچھا۔ حسن نے اثبات میں سر ہلادیا۔
”سب تم سے ملنے کے لیے بہت ایکسائیڈ تھے۔ اسپیشل عفیوہ۔“

فوارے کے دامن میں جمع صاف شفاف پانی کی سطح پر انگلی کی پور سے لیکر کھینچنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے بتایا۔

ساتھ ہی اس کا جوش و خروش یاد کر کے میرے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

”عفیوہ نے تو مجھے مخمخے میں ڈال دیا تھا۔ اس کو دیکھ کر لگا میرے سامنے سترہ سال والی نور کھڑی ہو۔ فاروق بھائی تعارف نہ کرواتے تو میں شاید اسے نور کہہ کر ہی پکار بیٹھتا۔“ حسن بھینپے ہوئے لہجے میں بتا رہا تھا۔

”واقعی!“ مجھے خوش گوار سی حیرت ہوئی۔ ”عفیوہ نے گی تو بہت خوش ہوگی۔ وہ ہمیشہ میرے جیسی نظر آتا چاہتی ہے۔ تمہیں پتا ہے حسن! اتنا شارٹ ہینڈ کٹ بھی اس نے اسی لیے کروایا ہے کہ میرا ہینڈ کٹ مین

اتج میں ایسا ہوتا تھا۔“
”اے شوق کے لیے دوسروں کو مخمخے میں ڈالنا کہاں کا انصاف ہے۔“ حسن نے پوری قوت سے برہنہ ہنسی اور اچھالتے ہوئے کہا تھا۔
مجھے اس کے اعتراض پر ہنسی آگئی۔

”عفیوہ میں میری شاہت ہے، لیکن اتنی بھی نہیں کہ کوئی مخمخے کی بات کرے، میرا خیال ہے حسن! عفیوہ کو دیکھ کر تم ہی الجھ گئے تھے۔“ میں نے لاپرواہی سے خیال ظاہر کیا۔

”ہاں۔“ حسن نے گہری سانس بھر کر کہا۔ ”شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو نور! میں ہی الجھ گیا تھا۔“

تب ہی دروازہ کھلنے کی آواز پر میں نے سر اٹھایا، عفیوہ جالی کا دروازہ دھکیلتی اپنے دونوں ہاتھوں میں آئس کریم کے کرشل باؤل پکڑے آرہی تھی۔ آنکھوں میں ازلی شرارتی چمک اور لبوں پر دلی دلی سی ہنسی۔ چونکہ حسن کی اس طرف پشت تھی، اس لیے آنکھیں مٹا کر اشارے کرنے لگی۔

”تم نے سنا ہے عفیوہ! حسن کیا کہہ رہے ہیں؟ ان کو تم بالکل میرے جیسی لگی ہو۔“ میں نے اس کے انداز نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”ریلی۔“ وہ پر جوش ہو کر چیخنی، پھر جلدی سے سیڑھیاں اتر کر میرے ساتھ آکھڑی ہوئی۔

”آپ نے مجھے اتنی اچھی خبر سنائی ہے، اسی خوشی میں آئس کریم کھائیں۔“

”میں آئس کریم نہیں کھاتا۔“ میں نے تو باؤل فوراً پکڑ لیا، لیکن حسن نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا تھا۔

”میں اتنے پیار سے لے کر آئی ہوں آپ پلیز کھالیں۔“ اس نے منت سے کہا، حسن نے ناچار باؤل پکڑ لیا۔

”حسن انکل! کیا شادی کے بعد آپ نور کے آئس کریم کھانے پر پابندی لگا دیں گے؟“ عفیوہ نے حسن کو چچے کے ساتھ کھیلا دیکھ کر پوچھا۔ اس کے سوال پر حسن نے تعجب سے پہلے اسے اور پھر مجھے دیکھا۔

”نہیں۔۔۔ میں نے تو ایسا کبھی نہیں کہا۔“
”اگر آدی ایسا کرتے ہیں جو چیز انہیں خود پسند نہ ہو اس کے لیے اپنی بیویوں پر بھی پابندی لگا دیتے ہیں۔ مجھے ایسے آدی اچھے نہیں لگتے۔“ عفیوہ نے ناگ چڑھا کر کہا تھا۔

اس کے انداز پر ہم دونوں کو ہنسی آگئی۔ حسن نے شاید عفیوہ کا دل رکھنے کے لیے ہی آئس کریم کھانا شروع کر دی تھی۔

”لیکن۔۔۔ پلیز نور پر آپ کوئی پابندی نہ لگائے گا اور ان کو بہت خوش رکھیے گا۔“
”اور کوئی حکم۔“

”میں حکم نہیں دے رہی ریکوسٹ کر رہی ہوں۔“ عفیوہ بری طرح جھینپتے ہوئے بولی۔

”اور اگر میں آپ کی ریکوسٹ نہ مانوں تو۔۔۔“ حسن کے انداز میں کچھ ایسا تھا کہ عفیوہ ہر اسال ہو کر میرا چہرہ دیکھنے لگی۔

”پلیز حسن! ہماری عفیوہ کو تنگ مت کرو۔“ میں ایک دم عفیوہ کو اپنی بازو کے حصار میں لیتے ہوئے کہا۔ حسن مسکرا کر سر جھکا گئے۔

عفیوہ چند لمحے حسن کو دیکھتی رہی، جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو، پھر سر جھٹک کر بولی۔

”نور! آپ کے پاس آؤر بھائی کا سیل نمبر ہوگا۔ می کہہ رہی ہیں انہیں فون کر کے پوچھیں ابھی تک آئے کیوں نہیں۔“ تب ہی گیٹ کی طرف سے آؤر آتا دکھائی دیا۔ وہ غلت میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہماری طرف آ رہا تھا۔

”نور! اگر میں آؤر بھائی کو شیطان کوں تو یہ گستاخی تو نہیں ہوگی۔“ اس نے شرارت کے ساتھ سنجیدگی سے پوچھا۔

”تمہارا تو پتا نہیں البتہ میں کوں گی تو گستاخی نہیں ہوگی۔ میں اس سے بڑی جو ہوں۔“ ہم دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگیں۔

”السلام علیکم۔“ آؤر دور سے ہی بازو پھیلاتا آیا اور حسن سے بغل گیر ہو گیا۔ پھر حال احوال دریافت

ہونے لگے، فون پر تو دونوں کا رابطہ تھا، بے تکلفی بھی تھی۔

”آپ نے آنے میں بہت دیر کر دی آذر بھائی! کھانا تو سارا ختم ہو چکا۔“ عفیوہ نے آذر سے کہا۔

”تمہیں اتنی توفیق نہ ہوئی کہ بھائی کے لیے پہلے تھوڑا سا نکال کر رکھ لو۔“ وہ بھی کہاں چوکنے والا تھا! اطمینان سے اس کے سر پر چیت لگا کر بولا۔

”تم کہاں گئے تھے آذر۔“ میں نے پوچھا۔

”میرے دوست کا ایک سیٹنٹ ہو گیا اسی کو لے کر اسپتال جانا پڑا، بس اسی کی وجہ سے آنے میں دیر ہو گئی۔“

”چھاندر چلیں۔ میں آپ کے لیے کھانا لگا دیتی ہوں۔“ عفیوہ نے اس سے کہا۔

”نہیں عفیوہ! کھانے کا تو اب ٹائم ہی نہیں رہا۔ مجھے ابھی واپس اسپتال بھی جانا ہے، اس لیے کھانا پھر کبھی سہی۔ فاروق بھائی اور بھابھی سے میں خود بات کر لوں گا یہاں تو صرف حسن سے ملنے آیا ہوں۔ یہ بتائیے حسن صاحب! ہمیں کب اپنی مہمان داری کا موقع دے رہے ہیں۔“ عفیوہ سے بات کرتے ہوئے وہ حسن کی طرف مڑا۔

”یار آذر! آخر اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ سب سے ملاقات تو ہو گئی۔ اب اسپیشلی کھانا آرینج کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تھوڑے دن کی بات ہے، پھر میں اور نویر تم سب کو اپنی شادی کی دعوت کھلائیں گے۔ کیوں نویر؟“

”ہاں بالکل۔“ میں نے کہا۔ ”آذر! کسی فارملٹی میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”کمال کرتی ہو نویر! اس میں فارمیٹ کی کیا بات ہے۔ بھئی میری خوشی ہے۔ بس تم لوگ ڈیسیائیڈ کر لو، کسی روز میرے ساتھ ڈنر کر رہے ہوں، پرسوں یا جس روز تم چاہو۔“ آذر نے حتمی انداز میں کہا اور ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

”کس قدر غلط بات ہے آذر بھائی! میں بھی یہیں موجود ہوں، آپ صرف ان دونوں کو انوائٹ کر رہے

ہیں، مجھے نہیں بلائیں گے۔“ عفیوہ نے کہا۔

”یہ بڑے لوگوں کا ڈنر ہوگا، بچوں کا وہاں کیا کام؟“ آذر حسب معمول اسے چڑاتے ہوئے بولا۔

”میں بچی نہیں ہوں۔“ وہ چلائی۔

”چھ! آذر نے مسخراڑایا۔“ تو پھر چھوٹی بچیوں کی طرح چھوٹی چھوٹی پونی ٹیل کیوں بناتی ہو۔“

”آپ کو کیا پتا۔ یہ آج کل کا فیشن ہے۔ نمل آپا سے جا کر پوچھئے گا۔“ حسب معمول جھگڑا شروع ہو گیا۔ تب مجھے بچاؤ کروانا پڑا۔

”خدارا جھگڑا مت کرو۔ عفیوہ! تم میرے ساتھ چلنا آذر کے انوٹیشن کی کیا ضرورت ہے۔“

”حسن بھائی! آپ تیار ہیں۔ شادی کے بعد یہ لڑکی اسی طرح آپ کی جیب خالی کرواتی رہے گی۔“ آذر نے چڑ کر حسن کو خبردار کرنا چاہا تھا تو وہ گہری سانس بھر کر بولا۔

”وہ محاورہ نہیں سنا۔ اوکھلی میں سردیا تو موسل سے کیا ڈرنا۔“ ان دونوں نے میرے گھورنے کی پروا کیے بغیر ایک زوردار تہقیر لگایا تھا۔

”پھر ہفتے کا پروگرام فائنل ہے نا؟“ آذر نے پھر پوچھا تو حسن نے اثبات میں سر ہلادیا۔

☆ ☆ ☆

”میرا خیال تھا منیہ اور حسن شادی کی تاریخ کے بارے میں کوئی بات ضرور کریں گے، لیکن انہوں نے تو ذکر ہی نہیں کیا۔“

سب مہمانوں کے رخصت ہونے اور لچ کا بکھراوا سمٹ جانے کے بعد ہم لیونگ روم میں بیٹھے چائے پی رہے تھے، جب ماریہ بھابھی نے اچانک کہا۔ چائے پی کر میرا اور رواجی کا ارادہ گھر جانے کا تھا، عفیوہ مجھ سے مسلسل رات اپنے یہاں رکنے کے لیے اصرار کر رہی تھی۔

”فاروق! میں کیا کہہ رہی ہوں، آپ نے میری بات سنی؟“ وہ کچھ فاصلے پر بیٹھی فاروق بھائی سے مخاطب تھیں۔ میں بظاہر عفیوہ کی طرف متوجہ تھی،

لیکن کل ان ہی کی طرف لگے ہوئے تھے۔

”سن لی ہے بھئی تمہاری بات، اب کیا جواب دوں؟“ بھائی جان نے بے زاری سے کہا۔

”میری مائیں اس معاملے میں اب دیر نہ کریں، پہلے شادی ہو جائے دعوتیں تو بعد میں بھی کھائی جاسکتی ہیں۔ آپ صبح ہی فون پر منیہ سے بات کریں کہ وہ لوگ اگر تاریخ طے کرنے کی رسم کر لیں۔“ بھابھی نے زور دے کر کہا۔

”ماریہ! تم ایک چیز کے پیچھے ہی پڑ جایا کرو، میری بات ہوئی تھی حسن سے۔ وہ پہلے گھر خریدنا چاہ رہا ہے۔ اس کے بعد ہی شادی کی تیاریاں شروع ہوں گی اس کی طرف۔ ہم اپنی تیاری مکمل کرتے ہیں، پھر دیکھ کر کوئی تاریخ رکھ لیں گے۔ حسن شادی کرنے ہی آیا ہے، پھر چند روز کے انتظار سے کون سی قیامت آجائے گی۔ تم تو تھیلی پر سروسوں جمانا چاہتی ہو۔“

بھائی جان کے لہجے میں بے زاری سی بے زاری تھی، بھابھی برا مانا کر خاموش ہو گئیں، لیکن بھائی جان کا حسن کا دفاع کرنے پر مجھے از حد خوشی ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

تیسرے روز ہم آذر کے ڈنر پر گئے۔ یہ پورا دن حسن نے اپنے پرانے دوستوں سے ملنے ملائے میں گزارا تھا۔ شام سات بجے میں نے حسن اور عفیوہ کو ہوٹل جانے کے لیے پک کیا۔ عفیوہ اپنے گیٹ سے نکلتے ہی ہم دونوں کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

”پہلے مجھے بتائیں، میں کیسی لگ رہی ہوں؟“ اس نے سی گرین اور گولڈن امتزاج کا بے حد اسٹائلس سوٹ پہنا ہوا تھا دوپٹے کے دونوں پلوؤں کو پوری بازو سے پھیلا کر اس نے گھوم کر پوچھا۔

”ہمیشہ کی طرح بہت اچھی لگ رہی ہو۔ اب فٹنٹ بیٹھو، ہم پہلے ہی لیٹ ہو چکے ہیں، آذر کا دوبار فون بھی آچکا ہے۔“

عفیوہ کے بیٹھے ہی میں نے گاڑی آگے بڑھادی۔

”یہ آذر بھائی کی کون سی ٹرین چھوٹ رہی ہے جو انہیں ڈنر کھلانے کی جلدی ہے۔ سات بجے کون ڈنر کرتا ہے۔“ عفیوہ نے پہلا نکتہ اعتراض اٹھایا۔

”نمل کو دیر تک گھر سے باہر رہنے کی اجازت نہیں ہے، جتنی جلدی ڈنر ختم ہو گا اتنی جلدی وہ گھر پہنچے گی۔“ میں نے فوراً وجہ بتادی۔

”میں آج آذر بھائی کی جیب خوب خالی کروانے والی ہوں۔ مجھے جو ہر وقت چڑاتے رہتے ہیں، خوب مزہ چکھاؤں گی۔“ اس نے ارادہ ظاہر کیا تو میں نے فوراً ٹوک دیا۔

”کوئی اوٹ پٹانگ حرکت کرنے کی ضرورت نہیں ہے نہ ہی تم آذر سے کوئی فرمائش کرو گی۔ بے شک تمہیں بہن مانتا ہے، لیکن کسی کی جیب پر اتنا بوجھ نہیں ڈالتے۔ جو سب آرڈر کریں گے، تم بھی وہ ہی کھالینا۔“

”پھر آپ مجھے یہیں اتار دیں، سب کی پسند کا ہی کھانا، کھانا ہے تو گھر میں می کی پسند کا ہی کھالوں گی، ہوٹل جانے کی کیا ضرورت ہے۔“ اس نے بسور کر کہا۔

”عفیوہ! اب منہ بنا کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے ڈپٹ کر کہا۔ میرے آگے کی بچی تھی اور میں چونکہ اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔ سو کچھ نصیحتیں کرنا ضروری سمجھا۔

”آپ مجھے ڈانٹ رہی ہیں۔ وہ بھی حسن انکل کے سامنے۔“

”کوئی بات نہیں عفیوہ! نویر کو کہنے دو۔ مجھے برا نہیں لگ رہا۔“ حسن نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

”واٹ؟“ عفیوہ نے صدمے سے چور آواز میں کہا۔ میں اور حسن ایک ساتھ ہنس دیے۔

”آپ کو برا نہیں لگ رہا، لیکن مجھے لگ رہا ہے۔“ میں سوچ رہی تھی۔ آپ اتنی دیر سے خاموش کیوں بیٹھے ہیں۔ لیکن اب سوچ رہی ہوں، اس سے تو اچھا تھا آپ خاموش ہی رہتے۔“ اس نے پھر خفگی سے کہا۔ ایک تو یہ کہ کم عمر تھی دوسرے بات کرنے کے

انداز میں بے ساختگی بھی بہت تھی جو دل میں آتا ہے بے دھڑک بولتی۔

”بھئی میں خاموش رہ کر سوچ رہا تھا۔ یہ سی گرین کلر تمہیں بہت سوٹ کر رہا ہے۔ کل رائل بلیو کلر بھی خوب لگ رہا تھا۔ تمہیں ایسے رنگ پہننا چاہئیں۔ اچھے لگتے ہیں تم پر۔“

”دیکھا نویر۔“ عفیوہ اپنی تعریف سن کر چبکی۔
”اس طرح تعریف کی جاتی ہے یہ نہیں کہ صرف اتنا کہہ دیا۔ ہمیشہ کی طرح اچھی لگ رہی ہو۔“

”ہمیں تو ایسی ہی تعریف کرنا آتی ہے۔“ میں نے بے بسی سے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”اوہ نہ۔۔۔ ایسی بے کار تعریف کا کیا کرنا ہے۔ حسن انکل! اگلی بار مجھے تعریف سننا ہوگی تو آپ کے پاس جاؤں گی۔“

میں نے بے ساختہ عفیوہ کو بیک مرر سے گھورا۔ اسے بولتے ہوئے تھوڑی احتیاط کرنی چاہیے۔ میں سوچ رہی تھی کچھ باتیں بچوں کے منہ سے اچھی نہیں لگتیں۔ انہیں نہیں کرنی چاہئیں۔

”اپنی پھوپھو سے بھی کہو۔ کبھی ڈارک کلرز پہنا کریں۔“ مجھے ایک نظر دیکھتے ہوئے حسن نے شرارتی انداز میں عفیوہ سے کہا۔

”میں تو کئی بار کہہ چکی ہوں، لیکن انہیں پھیکے سیٹھے شیڈز سے فرصت ملے تب نا۔“ عفیوہ نے بے زاری سے جواب دیا۔

”مجھے لائٹ کلرز پسند ہیں۔“ میں نے حسن پر ایک نظر ڈالتے ہوئے صفائی پیش کرنے والے انداز میں کہا۔

”اور سچی بات ہے ان کو سوٹ بھی کرتے ہیں، بلکہ کچھ کچھ شیڈز دیکھ کر مجھے لگتا ہے یہ بنے ہی ان کے لیے ہیں۔“ عفیوہ نے پھر کہا۔

”ہاں، لیکن کبھی کبھار ڈارک شیڈز بھی ٹرائے کرنا چاہیں۔ تبدیلی اچھا تاثر لاتی ہے۔“ حسن نے کہا۔

”ٹھیک ہے میں شادی کے کپڑوں میں دو تین جوڑے ڈارک شیڈز کے رکھ لوں گی۔“ میں نے فوراً

حسن کی بات بیان لی کہ اس کی بات پر میرے لیے بہت اہمیت رکھتی تھی۔

”واہ۔۔۔ حسن انکل! نویر آپ کی بہت مانتی ہیں، ورنہ میں کئی بار ڈارک شیڈز ٹرائے کرنے کا کہہ چکی ہوں، مگر مجال ہے جو انہوں نے میری سنی ہو، آپ کی بات پر کس طرح فوراً ہاں کہہ دی۔“

حسن نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ معنی خیز انداز میں مسکراتے شیشے سے باہر دیکھنے لگے۔

چند منٹ ہم تینوں خاموش رہے، پھر حسن نے پوچھا۔

”تم نے آفس سے کل کی چھٹی لی؟“

میں نے مایوسی سے سر ہٹائی میں ہلا دیا۔

”ایک تو یہ کہ کل اسٹاف میٹنگ ہے، اس لیے بھی چھٹی ملنا مشکل ہے۔ ایک کام ہو سکتا ہے اگر تم بارہ ساڑھے بارہ تک آفس آجاؤ تو مجھے ایک دو گھنٹوں کے لیے جانے کی اجازت مل جائے گی۔“ میں نے خیال آنے پر کہا۔

”اتنی فلیگ لینے کی کیا ضرورت ہے نویر! جس روز تم فری ہوگی اطمینان سے دیکھ لیں گے۔“ حسن نے کہا، لیکن میرے اصرار پر ناچار اسے ہامی بھرنا پڑی۔

آذر اور نمل ہمارے منتظر تھے۔ نمل نے سیاہ رنگ کا جوڑا پہن رکھا تھا اور اتنی خوب صورت لگ رہی تھی کہ آذر تو آذر میں بھی اس پر سے نظریں نہ ہٹا سکی۔ عفیوہ کی طرح اس کی بھی حسن سے پہلی ملاقات تھی اور عفیوہ کی ہی طرح اس نے بھی فوراً ہی حسن کو اوکے کر دیا۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں حسن کو سراہ رہی تھی۔

کھانا ہم نے خوش گوار موڈ میں کھایا۔ اسی دوران میں تو خاموش ہی رہی ان چاروں نے خوب باتیں کیں، نمل نے تو حسن کا اچھا خاصا انٹرویو کر ڈالا اور کھانا ختم کرتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ آذر فون کرنے ہال سے باہر گیا تھا۔ نمل زبردستی مجھے اپنے ساتھ باہر لے آئی۔

”مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ اس نے میرے

استفسار پر جواب دیا اور عفیوہ اور حسن کو اللہ حافظ کہتی باہر آگئی۔

”بتاؤ۔ اتنی سمجھ بوجھ والی لڑکی اور عقل نام کو بھی نہیں۔ مجھے تم پر ترس آ رہا ہے نور۔“ وہ باہر آتے ہی مجھ پر برسی۔

”کیا ہو گیا نمل؟“ میں حیران ہوئی۔

”یار! اتنا شاندار مگیٹر ہو۔ اور تم نے سترہ سال سے اسے کھلا چھوڑا ہوا تھا۔ آفرین ہے تم پر۔“

”تم پاگل ہو نمل۔“ مجھے اس کے انداز پر ہنسی آگئی۔

”جی نہیں۔ پاگل نہیں ہوں، بہت عقل مند ہوں اور دور اندیش بھی۔ دیکھنا ایک دن یہ بات تم خود مانو گی۔ بہر حال میں تمہارے لیے بہت خوش ہوں۔ حسن بہت اچھا لگا ہے مجھے۔ اللہ کرے وہ تمہیں اتنی ہی محبت سے رکھے، جتنی محبت تم ڈیزرو کرتی ہو۔“

”کیا لیکن؟“

”کچھ نہیں۔“ اس نے جیسے کچھ کہنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے فقط اتنا کہا۔

”تم نے سچی خوشیوں کے لیے بہت اسٹرگل کی ہے، میں اللہ سے دعا کروں گی، تمہیں تمہاری خوشیاں ضرور ملیں۔“ تب ہی آذر آگیا، ہم انٹرنس سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے وہاں جہاں پام کے درخت تھے۔

”تم جلدی کیوں جا رہی ہو نمل! میں تمہیں ڈراپ کروں گا، تھوڑی دیر تو اور رکو۔“

”تمہارے ساتھ آنا دیکھ کر سوتیلی امی جان نے مجھے زندگی سے ڈراپ کر دینا ہے۔“ اس نے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں کہا۔

”سوتیلی امی سے اتنا ڈرتی ہو تو آذر سے شادی کیسے کرو گی؟“ میں نے تعجب سے کہا۔

”شادی کے معاملے میں کسی کی نہیں سنوں گی میں۔ شادی تو اپنی مرضی سے ہی کروں گی۔“ اس نے دو ٹوک کہا۔

”میں تو کہتی ہوں تم بھی تیاری پکڑو۔ ایک ہی دن

شادی کرتے ہیں۔ بہت ایکسٹنشنٹ رہے گی۔“ میں نے خیال ظاہر کیا تو آذر فوراً بولا۔

”کس قدر بہترین خیال ہے۔ میں تو فوراً راضی ہو گیا ہوں، ویسے تو مجھے اس وقت بھی کوئی اعتراض نہیں۔ نمل اتنی پیاری لگ رہی ہے کہ میں کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں، لیکن افسوس۔ کورٹ تو اس وقت تک بند ہو چکا ہو گا۔“ اس نے نیم سنجیدگی کے ساتھ اور معنی خیزی سے نمل کو دیکھتے ہوئے کہا تھا اور میں حیران رہ گئی، کیونکہ پہلی بار میں نے آذر کی کسی بات پر نمل کو شرماتے دیکھا تھا۔

”آذر۔“ نمل نے سٹپنا کر اسے بری طرح گھورا، لیکن وہ آذر ہی کیا جوابز آجائے۔

”اچھا نور! تم جاؤ نا، مجھے نمل کو اور بلش ہوتے دیکھنا ہے بھی۔“ نمل نے جہاں اپنا سر پینک وہیں میں نے بے تکلفی سے ایک چپٹ اس کے کندھے پر رسید کر دی۔

”بہت ہی بد لحاظ ہو تم تو آذر۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا اور واپس ہال کی طرف چل دی۔

”عفیوہ کہاں ہے؟“ میں نے حسن کو تنہا بیٹھا دیکھ کر پوچھا۔ جواباً حسن نے کچھ بھی کہنے کے بجائے ہاتھ کی خفیف سی جنبش سے ایک سمت میں اشارہ کر دیا۔ میں نے دیکھا، عفیوہ ہال کے دوسرے کونے پر اس گل دان کے پاس کھڑی دکھائی دے رہی تھی، جس میں خوش رنگ پھولوں کی کلیاں بصارت کو متوجہ کر لی تھیں۔

”وہاں کیا کر رہی ہے؟“ میں نے آنکھوں کو سکوڑ کر عفیوہ کو دیکھتے ہوئے حسن سے پوچھا۔ حسن دائیں کہنی میز پر ٹکائے بند مٹھی اپنے منکراتے لبوں پر رکھے دلچسپ نظروں سے عفیوہ کو دیکھ رہا تھا۔

میرے سوال پر وہ اسی طرح اس طرح دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

”مجھ سے شرط لگا کر گئی ہے کہ اس ٹیبل سے چپس

کا پیکٹ اٹھا کر لائے گی۔“

”واٹ؟“ مجھے بری طرح دھچکا لگا۔ ”اس کا تو دماغ خراب ہے۔“ میں تیزی سے کرسی گھسیٹ کر اٹھی، تاکہ عفیوہ کو کوئی غلط حرکت کرنے سے روک سکوں، لیکن ایک بھی قدم اٹھانے سے پہلے ہی حسن نے میرا ہاتھ پکڑ کر روک دیا۔

”بیٹھو تو سہی، دیکھنے تو دو، وہ کیا کرتی ہے؟“

”حسن! آریو میڈ، ہم پبلک پلس پر ہیں، ابھی یہاں اچھا خاصا تماشا کھڑا ہو جائے گا۔“ میں نے اسے صورت حال کی نزاکت کا احساس دلانا چاہا، لیکن وہ لاپرواہی سے بولا۔

”کچھ بھی نہیں ہو گا نا، عفیوہ ابھی خالی ہاتھ واپس آجائے گی۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے اس سے شرط نہیں لگائی۔“

”حسن! وہ تو بچی ہے تمہیں تو کچھ سوچنا چاہیے تھا۔“ میں نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔ حسن نے رخ بدل کر مجھے گہری نظروں سے دیکھا۔

”بیٹھ جاؤ نور۔“ میں بیٹھی تو نہیں، لیکن ہنوز پریشانی سے اس طرف دیکھ رہی تھی۔ میرا ہاتھ ابھی بھی حسن کے ہاتھ میں تھا، ورنہ میں کب کی عفیوہ کے سر پر پہنچ چکی ہوتی۔

حسن نے ٹھیک کہا تھا عفیوہ واقعی چند منٹ کے بعد خالی ہاتھ منہ بسورتی واپس آگئی۔

”آپ شرط جیت گئے۔ میں تو ٹیبل کے قریب بھی نہیں جاسکی، چپس کا پیکٹ خاک اٹھاتی۔ میں اب آپ کو انکل نہیں کہوں گی۔“

”مجھے پتا تھا، تم ہار جاؤ گی۔“ حسن نے میری ناراضی کی بروا کیے بغیر خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”اب تمہیں باقی بچو کو بھی منع کرنا ہو گا کہ وہ مجھے انکل نہ کہیں، غضب خدا کا میں اتنا بوڑھا تو نہیں ہوں کہ انکل انکل کہہ کر میرے ناک میں دم کیا جائے۔“

”یہ کس کا آئیڈیا تھا؟“ میں نے مداخلت کی۔

”کون سا آئیڈیا؟“ عفیوہ چونکی۔

”یہ ہی کہ تم چوری کرنے اس ٹیبل تک جاؤ گی۔“

میں نے اسی طرح درشت لمبے میں پوچھا۔

”یہ چوری نہیں صرف ایک ایڈو پٹر تھا نور۔“ حسن نے کہا۔

”اور اگر عفیوہ پکڑی جاتی تو ہم یہ بات کس کس کو ایکسپلین کرتے۔“

”وہ خالی ہاتھ واپس آئی ہے نور۔“ حسن نے تحمل سے کہا تھا۔

”لیکن گئی تو چوری کرنے کے ارادے سے ہی تھی۔“ میں نے زور دے کر کہا۔

”تم ایک ہی بات کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو نور۔“

”حد ہے حسن! بجائے اس کے کہ تم عفیوہ کو اس کی غلطی کا احساس دلاؤ، تم اس کی طرف داری کر رہے ہو۔“

”پلیز نور! آپ حسن کو کچھ نہ کہیں۔“ عفیوہ نے ہمارے تیز بچوں سے گھبرا کر کہا۔

”شرط میں نے لگائی تھی، انہوں نے تو صرف اتنا کہا تھا اگر میں ہار گئی تو ان کو انکل کہنا چھوڑ دوں گی اور باقی سب کو بھی منع کروں گی کہ وہ انہیں انکل نہ کہیں۔“

”تم میں کچھ عقل ہے کہ نہیں؟ کبھی کبھی اسے استعمال کر لیا کرو، بچی نہیں رہی ہو بڑی ہو گئی ہو اب۔ کہ ایسی اوٹ پٹانگ حرکتوں کو نظر انداز کر دیا جائے۔“

میں نے دبی ہوئی آواز میں اسے جھڑکا، مجھے غصہ کم آتا تھا، خصوصاً اپنے بھائی، بہنوں کے بچوں پر تو بالکل بھی نہیں، لیکن اگر کسی بات پر دماغ گھوم جاتا تو اس کے چکر آرام سے رکنا مشکل ہوتا۔ عفیوہ کی حرکت نے مجھے بے حد طیش دلا دیا تھا، میرے ذہن میں رہ رہ کر یہ ہی بات آرہی تھی کہ اگر وہ پکڑی جاتی تو یہاں اچھا خاصا تماشا کھڑا ہو جاتا۔

آذر واپس آیا تو ہم تینوں ہی بالکل خاموش بیٹھے تھے، میں بھی اپنا غصہ محض حسن کی وجہ سے دبا گئی تھی کہ میں اپنی بیٹی کو اس کے سامنے شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھی، لیکن عفیوہ کا سر مستقل جھکا ہوا تھا اور چہرے پر شرمندگی کے تاثرات تھے۔ میں نے اس کی

کلاس لینے کا کسی اور وقت تک ارادہ ٹال دیا، لیکن پھر اس کے بعد ہم زیادہ دیر نہیں رکے۔ ہم جلدی ہی گھر جانے کے لیے اٹھ گئے۔

راستے بھر ہم تینوں خاموش رہے، لیکن جس وقت میں نے گاڑی فاروق بھائی کے گیٹ پر روکی۔ عفیوہ نے اپنی غلطی کے لیے معافی مانگی۔
”مجھے واقعی ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر پکڑی جاتی تو صرف میری نہیں بلکہ آپ سب کی بھی انسلٹ ہوتی۔“ میری طرف کے شیشے پر جھکی وہ شرمساری سے کہہ رہی تھی۔ مجھے بے اختیار اس پر پیار آیا، وہ میری بھتیجی تھی اور مجھے خوشی تھی کہ کم عمری کے باوجود اس میں سمجھ داری اتنی تھی کہ اس نے فوراً اصل نکتہ سمجھ لیا تھا۔

”آپ اب تو خفا نہیں ہیں۔ میں اگلی بار خیال رکھوں گی کہ کوئی ایسی شرارت کی کوشش نہ کروں۔“
”نہیں۔ میں خفا نہیں ہوں۔“ میں نے پیار سے اس کا گال تپتھپایا۔ تب عفیوہ ذرا سا جھکی اور میرے گال کا بوسہ لے لیا۔

”تھینک یو نویر، آپ کو میرا برتھ ڈے یاد ہے نا۔“ وہ پھر چمکی۔

”کیسے بھول سکتی ہوں۔“ میں مسکرائی۔
”حسن! آپ کو بھی پرسوں میری برتھ ڈے پارٹی میں آنا ہوگا۔“

”شیوور۔“ حسن نے محض اتنا کہا تب عفیوہ اللہ حافظ کہتی اندر چلی گئی، میں نے گاڑی آگے بڑھائی۔ راستہ پھر خاموشی سے گزرنے لگا۔

مجھے حسن کی خاموشی بہت محسوس ہو رہی تھی، پھر جب مجھ سے صبر نہ ہو سکا تو خود ہی اسے مخاطب کر لیا۔
”کیا سوچ رہے ہو حسن!“

”تمہیں عفیوہ کو اتنا نہیں ڈانٹنا چاہیے تھا۔“ وہ غالباً ”میری طرف سے پہل کا منتظر تھا۔ لیکن مجھے اس سے یہ جملہ سن کر عجیب لگا۔ ہاں ٹھیک ہے اسے وہاں

ہوٹل میں میرے غصے پر ناگواری ہوئی تھی، مگر یہ ایسی بات نہیں تھی کہ اسے طول دیا جاتا۔
”میں نے عفیوہ کو کم ڈانٹا ہے، وہ زیادہ کی مستحق تھی۔“

”یہ کم تھا؟ تو زیادہ کتنا ہوگا؟“
”جتنا بھی تھا ٹھیک تھا۔ میں بڑی ہوں اس کی کیا ڈانٹ نہیں سکتی؟ ماریہ بھابھی ہوتیں تو وہ بھی یہ ہی کرتیں۔“

”ماریہ بھابھی عفیوہ کی ماں ہیں، انہیں حق ہے کہ وہ اسے ڈانٹیں۔“

”میں نے عفیوہ کو ہمیشہ اپنی بیٹی کی طرح سمجھا ہے۔ اتنا پیار کرتی ہوں کیا غلط بات پر ڈانٹنے کا حق نہیں ہے مجھے؟“

”تمہیں ساری دنیا کو ڈانٹنے کا ان کی غلطیاں پوائنٹ آؤٹ کرنے کا حق ہے۔ بزرگ ہو تم سب کی۔“ حسن نے اچانک تیز لہجے میں کہا۔ میں نے کسی قدر حیرانی سے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”عفیوہ نے تمہارے سامنے مجھ سے ایکسکیوز کیا ہے، اسے اپنی غلطی کا احساس تھا، تب ہی ایکسکیوز کیا۔ جب اسے ہی اعتراض نہیں تو تمہیں کیوں اعتراض ہو رہا ہے۔“

”کیونکہ تم نے ان ڈانٹ کھیلی مجھے بتایا ہے کہ عفیوہ کو شرارت بر آکسا کر میں نے غلطی کی۔“ حسن نے سابقہ لہجے میں کہا۔

میں ایک بل کو ٹھک گئی۔ سمجھ نہیں پائی مجھے حسن کو کس طرح مطمئن کرنا چاہیے۔

”میں نے یہ نہیں کہا کہ تم نے عفیوہ کو اکسایا تھا، لیکن تم نے اس کی شرارت میں ساتھ دیا تھا جو کہ غلط تھا۔ تم بڑے تھے، وہ بچی تھی، وہ نا سمجھی کر رہی تھی تو تم اسے سمجھا دیتے، تمہاری جگہ میں ہوتی تو یہ ہی کرتی۔“

مینڈہ آیا کے گھر کے سامنے گاڑی روک کر میں نے تحمل سے اپنا نکتہ نظر اسے سمجھانا چاہا۔
”بزرگ بننے کا شوق تمہیں ہے مجھے نہیں۔“

دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے ہوئے اس نے درشتی سے کہا۔

”لیکن ہم عفیوہ کے بزرگ ہیں حسن!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تھا۔ حسن نے جھٹکے سے دروازہ کھولا اور جھٹکے سے بند کر کے چلا گیا۔ میں نا سمجھی سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔

وہ رات بڑی بے چینی میں گزری۔ حسن کی خفگی کا احساس میری روح پر سل کی طرح دھرا ہوا تھا۔

ساری رات میں نے کروٹیں بدل کر گزاری۔ پھر ذرا دیر کو آنکھ لگی تو فجر کی پہلی اذان کے ساتھ نیند ٹوٹ گئی اور حواس میں آتے ہی جو پہلا خیال مجھے آیا وہ یہ ہی تھا کہ اپنی غلطی نہ ہونے کے باوجود مجھے حسن کو منالینا چاہیے۔ یہ خیال آتے ہی میں اٹھ کر بیٹھ گئی اور سائڈ ٹیبل پر رکھا سیل فون اٹھا کر حسن کا نمبر ملانے لگی۔

پہلی بیل بجتے ہی میرا دل ہنگامی انداز میں دھڑکنے لگا۔ دھڑکن کی آواز مجھے کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔ دوسری بیل بجنے تک میرا دل خدشات سے بھر گیا۔ حسن مجھ سے کبھی خفا نہیں ہوا تھا، لیکن اگر آج خفا ہو گیا تو۔۔۔ مجھے عجیب و غریب وسوسے اتنی سی دیر میں بری طرح ستانے لگے تھے۔ وسوسے اور دھڑکن سونیوں کی طرح دوڑ رہے تھے۔ جیسے کوئی خطرے کی گھڑی ہو، تیسری بیل بجی۔

”ہیلو۔!“ میرے ارد گرد سکون پھیل گیا۔ میں نے سکون سے گہری سانس بھری، گویا تختہ دار پر کھڑے شخص کو پھانسی مل جانے کی اطلاع مل گئی ہو۔

”تم اب تک جاگ رہی ہو نویر!“ اس نے پوچھا۔
”تم بھی تو جاگ رہے ہو۔“ میں نے آہستگی سے کہا کہ میں اس کی آواز کے ہر تاثر سے واقف تھی۔
”میں سوچ رہا تھا ہماری جو بحث ہوئی وہ نہیں ہونا

چاہیے تھی۔“ اس نے کہا، میں مسکرائی۔
”میں بھی یہ ہی سوچ رہی تھی۔“
”ہمارے خیالات بہت ملتے ہیں۔“

”پوچھ رہے ہو یا بتا رہے ہو؟“ میں نے ہنس کر کہا۔

”ہاں نہیں۔“ وہ خاموش ہو گیا، میں بھی خاموش رہی، پھر حسن نے کہا۔

”نویر! تم ساری زندگی خوش رہنا، تمہاری خوشی میری پوری زندگی کے لیے ایک بڑا طمینان ہوگی۔“
”تم مجھے خوش رکھنا حسن! تمہارا ساتھ، تمہاری محبت، تمہاری توجہ میری ساری زندگی کی خوشی ہوگی۔“ میں نے بے ساختہ کہا تھا۔

”ہاں۔“ میں نے حسن کی آواز میں مسکراہٹ کا تاثر محسوس کیا۔

”چلو اب سو جاتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”ہاں۔۔۔ اب سو جاتے ہیں۔“ میں نے کہا، لائن کٹ گئی۔ میں نے پرسکون ہو کر سیل فون کو دیکھا اور اپنی روح پر رکھے ہر طرح کے بوجھ سے آزاد ہو کر وضو کرنے کے لیے اٹھ گئی۔

بارہ بجتے ہی میں نے لاشعوری طور پر حسن کا انتظار شروع کر دیا اور ٹھیک ساڑھے بارہ بجے جب اس نے آفس میں قدم رکھا تو میرے لبوں پر مسکراہٹ اور خانہ دل میں روشنیاں سی بکھر گئیں، لیکن مجھے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ روشنیاں میرے چہرے سے چھلک کر سب کو متوجہ کرنے کا سبب بن رہی ہیں۔

”نویر! تم نے اپنے اندر بلب فٹ کروایا ہے؟“
”یار! بلب کو چھوڑو، یہ بتاؤ، یہ ہینڈ سم کون ہے، جس کو دیکھ کر اتنا مسکرایا جا رہا ہے۔“ سارہ کی بات کے جواب میں وردہ نے کہا۔

”کچھ دن میں نویر کی شادی ہونے والی ہے، تم لوگوں کے خیال میں یہ حسن بھائی کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے؟“ مکمل نے ان دونوں سے کہا تھا، ہم

چاروں کے کیمن ساتھ ساتھ ہی تھے۔
نمل نے ان چاروں کو بتایا تھا، لیکن چند منٹ میں
حسن کی آمد کی خبر سارے میں پھیل گئی، ہمارے آفس
کا ماحول بے حد دوستانہ تھا، صرف یہ ہی نہیں بفضل
خدا اپنے سارے اسٹاف ممبرز سے اچھی صاحب
سلامت بھی تھی، تب ہی حسن کی خوب پذیرائی
ہوئی۔ سب لوگ بہت اچھے طریقے سے ملے اور تو اور
مینجر صاحب اس سے چائے کے لیے اصرار کرنے
لگے۔ حسن نے معذرت کرنا چاہی تو مینجر صاحب نے
خوش دلی سے کہا۔

”آپ کا کوئی ایسکیموز قابل قبول نہیں ہو سکتا
حسن صاحب۔ آپ کو نہیں پتا مس نویر کی وجہ سے
آپ ہمارے لیے کتنے اسپیشل ہیں، اس طرح بغیر کچھ
کھائے پیے تو ہم آپ کو جانے نہیں دیں گے، کیوں
نویر بیٹی! آپ ہی ہماری سفارش کیجیے۔“
لیکن میری سفارش کی ضرورت ہی نہیں پڑی
حسن نے چائے پینے کی ہامی بھری تھی۔

تقریباً ”ڈیڑھ گھنٹہ بعد جب ہم آفس سے نکلے تو
حسن کو ملنے والی پذیرائی نے مجھے بے حد مسرور کر دیا
تھا۔ لیکن حسن کے ایک جیلے نے جیسے میری خوشی پر
پانی ڈال دیا۔
”کیا ضرورت تھی اپنے کو لیگز کو میرے بارے میں
بتانے کی؟“

میں گاڑی اشارت کر رہی تھی، جب حسن کے
استفسار نے مجھے اتنا حیران کیا کہ چند لمحے کے لیے میں
ٹھنک سی گئی۔

”یہ کیا سوال ہے حسن! سب کو پتا ہے میری
شادی ہونے والی ہے، شادی کے سلسلے میں لیو
اپلیکیشن بھی میں کچھ روز میں سمٹ کروا دوں گی۔ تم
کہہ رہے ہو مجھے نہیں بتانا چاہیے تھا اور اب کیا کہتی
ہاف لیو لے کر کسی اجنبی کے ساتھ جا رہی ہوں۔“ میں
نے گاڑی پارکنگ سے نکالتے ہوئے کہا۔

حسن چپ چاپ شیشے سے باہر دیکھ رہا تھا۔
”تمہیں اتنا اسپیشل پروٹوکول ملا، تمہیں خوشی نہیں
ہوئی؟“ میں نے پوچھا۔

”ایسی بات نہیں ہے۔“ اس نے تیزی سے کہا۔
”پھر کیسی بات ہے؟“

”پتا نہیں۔“ اس نے آکٹا ہٹ کے ساتھ کہا۔ میں
حیران تھی، آخر ایسی کون سی بات ہو گئی جو حسن کو پسند
نہیں آئی اور اب وہ بے زار لگ رہا تھا۔

”تم ذرا اسپید بریڈاؤ۔ ڈیٹر بے چارہ ہمارے انتظار
میں سوکھ رہا ہو گا۔“

اس نے سابقہ انداز میں کہا تھا۔ میں حیرانی ونا سمجھی
کے بندھو لے میں جھولتی اس کے پل میں تولہ پل میں
ماشہ والے مزاج پر غور کرتی رہی۔

”نہیں جمیل صاحب! آپ کے دکھائے ہوئے
دونوں بنگلے ہمیں پسند نہیں آئے، کل فون پر آپ کو
اپنی ساری Requirments (ضروریات) بتاتا تو
دی تھیں۔ آپ پھر بھی ایسے بنگلے دکھانے لے آئے
ہیں۔“

”سیٹلائٹ ٹاؤن میں بھی ایک بہت اچھا بنگلہ ہے
سر! چلیے میں آپ کو وہ دکھا دیتا ہوں۔ مجھے امید ہے
آپ کو ضرور پسند آجائے گا۔“ پر اپنی ڈیٹر جمیل اختر
نے کہا۔

”آپ نے پہلے دو بنگلوں کی دفعہ بھی یہ ہی کہا تھا۔“
حسن نے رکھائی سے کہا۔

”لیکن سر!“
”دیکھیے، لیکن ویکن کچھ نہیں۔ آپ اگلے ایک
دو روز تک ہمیں ہماری Requirment کے
مطابق گھر دکھائیں اور وائر ہم کوئی اور ایجنٹ ہائر کر لیں
گے۔“

حسن نے مجھے آگے چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے
جمیل اختر سے کہا۔ مجھے حسن کی تلخی سمجھ نہیں آرہی
تھی، اس نے بہت معمولی باتوں کی بنا پر دونوں بنگلے

ریجیکٹ کر دیے تھے۔ حالانکہ مجھے دونوں ہی اچھے
لگے تھے۔

”میرے سر میں شدید درد ہے۔“ ہم گاڑی میں
واپس آکر بیٹھے تو حسن نے اپنا سر سہلاتے ہوئے کہا۔
”پھر تو گھر چلتے ہیں، تم آرام کر لیتا۔ میں خود ہی
مارکیٹ چلی جاؤں گی۔“ میں نے تشویش سے اسے
دیکھتے ہوئے کہا۔

”مارکیٹ کیوں جانا ہے؟“ حسن نے پوچھا۔
”تم بھول گئے، کل عفیوہ کا برتھ ڈے ہے۔ مجھے
اس کے لیے گفٹ لینا ہے۔“

”گفٹ تو مجھے بھی لینا تھا۔“ حسن نے کہا۔
”چلو پھر پہلے گفٹ لے لیتے ہیں۔“
”لیکن حسن! تمہاری طبیعت؟“ میں تذبذب سے
بولی۔

”نہیں پوری نہیں ہوئی، اس لیے سر میں درد ہے۔“
حسن نے کسی قدر بے زاری و لا پرواہی سے کہا۔
”مجھے تو عفیوہ کی پسند ناپسند کا نہیں پتا۔ اب تم
ساتھ ہو تو میری طرف سے بھی کوئی گفٹ خرید لیتا۔“

حسن کے کہنے پر میں نے اثبات میں سر ہلادیا اور ہم
گلابرگ جانے کے بجائے مارکیٹ آگئے۔ اپنی طرف
سے میں نے عفیوہ کے لیے Gucci پرس اور
بوتیک سے ایک خوب صورت جوڑا خرید لیا، لیکن
جب حسن کی طرف سے تحفہ خریدنے کی باری آئی تو
جو چیز مجھے پسند آتی اس کے لیے حسن انکار کر دیتا اور جو
حسن پسند کرتا مجھے یقین ہوتا وہ عفیوہ کو پسند نہیں
آئے گا۔

”حسن! میں سوچ رہی تھی جمیل اختر سے ہی کہوں
میرے گھر کو فروخت کروا دے۔“ ایک گفٹ شاپ پر
ریک میں ڈس بلے کیے گفٹ آئٹمز کو دیکھتے ہوئے
میں نے حسن سے کہا۔

”رخصتی تو میری فاروق بھائی کے گھر سے ہی ہوئی
ہے۔ شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی میں اور بواجی ان
کی طرف شفٹ ہو جائیں گے۔ پھر اس گھر کو سنبھال
کے کیا کرنا ہے؟“

”تنی جلدی کیا ہے فروخت کرنے کی۔“ حسن
نے کہا۔ ”کبھی اچانک بھی کسی چیز کی ضرورت پڑ جاتی
ہے۔“

میں نے کن آنکھوں سے اس کا موڈ بھانپنے کی
کوشش کی اور جھجکتے ہوئے کہا۔

”حسن! میرا گھر اچھا خاصا ہے، میں سوچ رہی تھی
کیوں نہ شادی کے بعد ہم یہاں ہی شفٹ
ہو جائیں۔“

”نا ممکن۔ لوگ کیا کہیں گے، میں تمہیں ایک گھر
بھی لے کر نہیں دے سکا۔ نہیں بھئی۔ مجھے دنیا کی
باتیں نہیں سننی۔“

”دنیا کی تو تم نے خوب کئی دنیا کا تو کام ہی باتیں بتانا
ہے حسن!“

”پلیز نویر! اس ایٹو کو ہمیں ختم کرو، میں نے تم
سے پہلے بھی کہا تھا، مجھ سے اس بارے میں بات مت
کرنا۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ میں نے فوراً ”کہا، مبادا وہ خفا
ہو جائے۔“ میں جمیل اختر سے کہہ دیتی ہوں وہ ہمیں
کوئی بے انگ گیسٹ تلاش کر دے۔“

حسن چند لمحے خاموش رہا اور ریک سے ایک
بے حد نفیس ٹیبل لیپ اٹھا کر دیکھنے لگا۔

”تنی جلدی کیوں ہے تمہیں اپنا گھر خالی کرنے
کی؟“ اس نے ٹیبل لیپ واپس رکھتے ہوئے کہا۔

”تم وہاں آکر رہنے پر راضی نہیں ہو۔ شادی کرنی
ہے تو خالی کرنا ہی پڑے گا۔ اچھا ہے کرائے دار رہ رہ
گے تو حفاظت بھی ہوتی رہے گی۔“

”میرا نہیں خیال۔ ہمیں یہاں کوئی چیز عفیوہ کو
پسند کے مطابق ملے گی۔ چلو کسی اور شاپ میں دیکھ
لیتے ہیں۔ یا کوئی جیولری پسند کر لو، میں نے دیکھا ہے
عفیوہ شوق سے استعمال کرتی ہے جیولری۔“ میری
بات کے جواب میں حسن نے آکٹا ہٹے ہوئے انداز میں
کہا۔

”ہاں جیولری اسے پسند ہے۔ لیکن۔۔۔“ تب ہی
میری نظر ریک کے ایک کونے میں بڑے سے وائر

پچھے رکھی کرشل کی گڑیا پر پڑی۔ میں نے ہاتھ برہا کر گڑیا اٹھالی۔

پور کرشل سے بنی ہوئی یہ گڑیا بے حد خوب صورت اور نفیس تھی۔ ایک ہاتھ برابر ہوگی، اپنے پیروں تک آتے نفیس ملبوس کو اس نے چٹکیوں میں پکڑ کر خفیف سا اور اٹھار کھاتھا۔ اس عمل سے فراک کی فرل پر ایک ہلکی سی لہر پیدا ہو رہی تھی۔ تمکنت سے اسی صراحی دار گردن، گمرتک آتے سلکی بالوں کی آبشار اور سر پر رکھنا زک تاج۔

اس کرشل کے شاہکار کو ہاتھوں میں پکڑے میں حیران کھڑی تھی۔ آخر اس چمکتے دکتے روشنیوں سے مزین ڈسپلے سینٹر میں اتنی بہترین چیز کو ایک کونے میں کیوں رکھا گیا تھا۔

”حسن! یہ ڈول بہت خوب صورت ہے عفیوہ کو یقیناً پسند آئے گی۔“ میں نے حسن کو دکھاتے ہوئے کہا۔ حسن کی آنکھوں میں بھی چمک سی اتر آئی۔

”عفیوہ خود بھی اس گڑیا جیسی ہے۔ ہاں اسے ضرور پسند آئے گی۔“ اس نے کہا۔ ساتھ ہی اس نے سیلزمین کو اسے پیک کرنے کے لیے کہا۔

”سر! اسے آپ یہیں رہنے دیں، میں آپ کو فریش پیس نکال دیتا ہوں۔“ سیلزمین ایک طرف چلا گیا۔ میں اور حسن کاؤنٹر کی طرف آگئے۔ لیکن میں نے گڑیا کو ریک میں واپس نہیں رکھا تھا، بلکہ ساتھ ہی لے آئی تھی اور لا کر کاؤنٹر پر رکھ دیا تھا۔

چند منٹ بعد سیلزمین واپس آیا تو اس نے اس دوسرے کرشل پیس کو بھی لا کر کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

”یار! تم نے خواجواہ ٹائم ضائع کروایا، یہ دونوں پیس ایک سے ہیں، اس پہلی والی گڑیا کو ہی پیک کر دیتا تھا۔“ حسن نے سیلزمین سے کہا۔ لیکن میری نظریں ان دونوں گڑیوں کا موازنہ کر رہی تھیں۔

کاؤنٹر کے عین اوپر روشن آرائشی لیمپ کی روشنی ان پر منعکس ہو رہی تھی اور فرق صاف دکھائی دے رہا تھا۔ گوکہ دونوں گڑیا ایک سی تھیں، ہو سوا ایک سی، لیکن ان میں ایک فرق تھا، ایسا فرق جو سیلزمین کی لا کر

رکھی ہوئی گڑیا کو میری ریک سے اٹھا کر لائی ہوئی کرشل کی گڑیا سے زیادہ خوب صورت دکھا رہا تھا۔

”ٹھیک ہے سر! اگر آپ کو یہ ہی پسند ہے تو میں اسے پیک کر دیتا ہوں۔“ سیلزمین نے حسن کی بات کے جواب میں کہا تھا۔

”نہیں۔۔۔ آپ اسی ڈول کو پیک کریں جسے ابھی آپ نکال کر لائے ہیں۔“

”یہ زیادہ خوب صورت ہے۔“ یہ مختصر جملہ میں نے حسن سے کہا تھا۔ میری بات پر حسن نے آنکھیں سکوڑ کر ان کرشل پیس کو دیکھا، پھر جھلا کر بولا۔

”دونوں ایک سی ہیں نور! ایک نقطے کا بھی فرق نہیں ہے۔“

”ہاں دونوں ایک سی ہیں، دونوں خوب صورت ہیں، لیکن دوسری ڈول زیادہ اچھی ہے۔ بہتر چیز کی خرابی اس وقت سامنے آتی ہے جب بہترین چیز نظر آئے۔ کیونکہ وہ ریک میں ڈس پلے نہیں ہوئی تھی۔ اس پر گرد کی ہلکی سی تہ بھی نہیں پڑی، نہ ہی ہاتھ در ہاتھ پکڑے جانے سے کرشل کی شفاف سطح دھندلائی ہے۔“

حسن چپ چاپ ان ڈولز کو دیکھتا رہا، پھر اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گہری سوچ کی پرچھائیاں ہلکورے لے رہی تھیں۔

”کیا سوچ رہے ہو حسن!“ میں نے اس کی خاموشی سے اکتا کر کہا۔

”ہمارے پاس جو اس ہے۔ بہتر چیز اور بہترین چیز۔ سامنے ہو تو بہترین کو چن لینا چاہیے۔ اس کو پیک کر دیں۔“

میں نے سیلزمین سے کہا تھا۔

میں آفس سے نکل رہی تھی کہ فاروق بھائی کا فون آگیا۔

”تم گھر جانے سے پہلے میری طرف سے ہو کر جانا۔“ انہوں نے چھوٹے ہی کہا۔

”فاروق بھائی! میں آج بہت تھکی ہوئی ہوں، صبح لس جاتے ہوئے آپ کی طرف کا چکر نہ لگا لوں۔“

”نہیں۔۔۔ آپ نور سے کہیں۔ گھر جانے سے پہلے فاروق بھائی کوئی جواب دیتے ان کے پیچھے سے لے مار یہ بھابھی کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔

”نہیں۔۔۔ آپ نور سے کہیں۔ گھر جانے سے پہلے ہماری طرف چکر لگائے۔ آپ بتادیں نا، ضروری ت کرنی ہے اس سے۔“

”نور بیٹی! تم ادھر سے ہو کر جاؤ، تم سے کچھ کام ہے، صبح عجلت میں بات نہیں ہو سکے گی، کھانا بھی مارے ساتھ کھانا۔ بواجی کو میں فون کر دیتا ہوں کہ نہیں واپسی میں دیر ہو جائے گی۔“

وہ جیسے سب سیٹ کیے بیٹھے تھے۔ مار یہ بھابھی کی بات سن کر میری پیشانی پر بل پڑا تھا، لیکن فاروق بھائی کی بات سن کر کئی بل پڑ گئے۔ لیکن فاروق بھائی کو مثبت جواب دے کر میں نے فون بند کر دیا اور موبائل فون کو بے زاری و لاپرواہی سے ساتھ والی سیٹ پر اچھال دیا۔

آخر فاروق بھائی جان کو کیا ضرورت تھی مار یہ بھابھی سے ڈکٹیشن لینے کی؟ اس خیال نے میری دن بھر کی تھکاوٹ میں اضافہ کر دیا اور مجھے بے پناہ اکتاہٹ محسوس ہونے لگی تھی، کیونکہ میں جانتی تھی مار یہ بھابھی، فاروق بھائی جان کے ذریعے مجھ سے کون سی ضروری بات ڈسکیس کروانا چاہتی ہیں۔ انہیں ایک ہی بے چینی لاحق تھی آخر میری اور حسن کی شادی کی تاریخ کیوں فاسٹل نہیں ہو رہی؟

دس روز سے میری حسن سے تفصیلی بات نہیں ہو سکی تھی۔ وہ اپنے بھانجوں اور دوستوں کے ساتھ نادرن ایریا ز چلا گیا تھا۔ مکان خریدنے کا معاملہ ہنوز کھٹائی کا شکار تھا۔ اب ایسی صورت حال میں شادی کی تاریخ کیسے رکھی جاسکتی تھی۔

فاروق بھائی مجھے برآمدے میں ٹہلتے ہوئے ملے۔ ان کی آنکھوں میں سرخی تھی اور چہرہ ستا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

”کیا بات ہے بھائی! آپ۔۔۔ آپ پریشان لگ رہے ہیں۔“ میں نے بغور انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں پریشانی کیسی؟ تم اندر آؤ۔“ انہوں نے گڑبڑا کر مسکراتے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

لی وی لاؤنچ میں مار یہ بھابھی اور عفیوہ دونوں موجود تھیں۔ عفیوہ بھابھی کے گھٹنے پر سر رکھے صوفے پر لیٹی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میرے مسکرا کر سلام کرنے پر وہ دونوں خاموش رہیں، پھر مار یہ بھابھی نے کچھ گڑبڑاتے ہوئے جواب دیا۔

”آؤ۔۔۔ نور! وہاں کیوں کھڑی ہو۔“ عفیوہ اسی طرح چپ چاپ مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے تاثرات کچھ ناقابل فہم سے تھے اور صرف اسی کے تاثرات نہیں مار یہ بھابھی کے تاثرات بھی مجھے چونکا رہے تھے۔

”کیا بات ہے عفیوہ گڑیا! طبیعت ٹھیک ہے میری چندا کی۔“ میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پیار سے پوچھا۔ میرا اتنا پوچھنے کی دیر تھی، عفیوہ کی آنکھوں میں تیزی سے پانی جمع ہونے لگا۔ اس نے اپنے لبوں کو بھیج لیا تھا۔ اگلے ہی بل وہ جھٹکے سے مجھ سے لپٹ گئی اور گھٹ گھٹ کر رونے لگی۔

”عفیوہ۔۔۔ چندا کیا ہوا ہے؟“ میں حیران پریشان اس کے بالوں کو سہلانے لگی، ساتھ ہی میں نے فکر مندی سے فاروق بھائی کو دیکھا جو سر جھکائے کھڑے تھے۔

”عفیوہ! پلیز مجھے بتاؤ۔ تمہیں کیا ہوا ہے؟“ اس کے یوں رونے پر میں بے حد پریشان ہو گئی تھی۔

”عفیوہ! میں نے تم سے کیا کہا تھا۔“ مار یہ بھابھی نے برہہ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

”آئی ایم سوری نور! ایک شرمیلی سوری۔“ عفیوہ تیزی سے مجھ سے الگ ہوئی اور بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔

میں ہکا بکا کبھی بند دروازے کو تو کبھی فاروق بھائی

اور بھابی کو دیکھ رہی تھی۔

”عفیوہ کو کیا ہوا ہے بھائی! بھابی! مجھے بتائیں۔“
”تم بیٹھ جاؤ نور! ماریہ بھابی اسی انداز میں جس میں عفیوہ سے مخاطب ہوئی تھیں سمجھ سے کہا۔

”بھائی جان پلیز مجھے بتائیں کیا ہوا ہے آخر؟ عفیوہ کیوں رو رہی ہے؟ آپ نہیں بتائیں گے؟ میں عفیوہ سے پوچھتی ہوں۔“

”نہیں نور! عفیوہ سے مت پوچھو۔ میں بتاتا ہوں۔“ بھائی جان نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا، پھر وہ آہستگی سے چلتے ہوئے میرے قریب آکر بیٹھ گئے۔

وہ جیسے لفظ تلاش کر رہے تھے۔ میرا سارا وجود گویا سماعت بنا بیٹھا تھا۔

”بات یہ ہے نور! آج۔۔۔ منیہہ آئی تھی اسے حسن نے بھیجا تھا، حسن نے دراصل عفیوہ کے لیے اپنا پروزل بھجوایا ہے۔“

جھلی ہوئی نظریں۔ شرمسار لہجہ۔

میرے دل کو کسی شکنجے نے اس قوت سے جکڑا کہ میرا سارا وجود بے جان سا ہو گیا، میں دم بخود۔ ششدر تھی یا کیا۔۔۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں بہت دیر تک نہ میں کچھ بول سکی نہ سانس لے سکی۔

بس چپ چاپ بھائی جان کو دیکھتی رہی۔
”آپ۔۔۔ کیا کہہ رہے ہیں بھائی جان؟“

”تمہارے بھائی جان بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں نور! حسن نے واقعی عفیوہ کے لیے پروزل بھجوایا ہے۔ منیہہ بہت شرمندہ ہو رہی تھیں۔ بہت رو رہی تھیں کہ حسن نے انہیں مجبور کیا ہے، لیکن میں نے منیہہ کی بہت بے عزتی کی۔ اگر حسن کی آنکھوں کا لحاظ ختم ہو ہی گیا ہے تو انہیں حسن کا ساتھ دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اسے سمجھانا چاہیے تھا۔ نہ کہ منہ اٹھا کر ہمارے گھر آجانا چاہیے تھا۔“

”بھابی! جھوٹ کہہ رہی ہیں نا بھائی جان۔ آپ۔۔۔ آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔“ میں نے سنا میری آواز کانپ رہی تھی۔

”ہمیں کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی نور! نہ ہی تمہارا بھابی جھوٹ بول رہی ہیں۔“ بھائی جان نے تیز سے کہا۔ ان کی آنکھوں میں بے بسی بھی تھی اور کچھ بھی۔

”مجھے حسن سے ایسے گھٹیا پن کی توقع نہیں تھی اس نے تو حد ہی کر دی۔ میری بہن کا منگیترا ہو کر میرا بیٹی کے لیے رشتہ بھجوا رہا ہے۔ کیا اس کی حرکت شرافت کے کسی بھی معیار پر رکھا جاسکتا ہے؟ اچھا، اس نے منیہہ کو بھجوایا۔ خود آنے کی ہمت کرتا تو۔۔۔ پیروں پر چل کر واپس جانے کے قابل میں اسے ہرگز نہ چھوڑتا۔“ آنکھوں میں نمی لیے وہ عالم طیش میں بول رہے تھے۔

”فاروق بھائی! پلیز۔۔۔ آپ حسن کے بارے میں اس طرح بات نہ کریں۔“ یک دم میں میرا دل اس شکنجے سے آزاد ہوا تھا اور میں نے بے قراری سے کہا تھا۔

”نور! تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟“ ماریہ بھابی نے کہا۔ ”تم نے سنا بھی ہے تمہارے بھائی جان کیا کہہ رہے ہیں۔“

”بھابی! آپ غلط بیانی نہ کریں۔“
”نور! ہوش کرو۔۔۔ میں یا فاروق کیوں غلط بیانی کریں گے۔ حسن نے سچ منیہہ کو ہمارے پاس بھجوایا ہے کہہ کر کہ وہ عفیوہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ سنا تم نے۔ شادی۔“ ماریہ بھابی نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا تھا۔

”حسن ایسا نہیں کہہ سکتا بھابی! میں اسے بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں۔۔۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے، میرے علاوہ کسی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ پھر عفیوہ۔۔۔ وہ تو میری بیٹی جیسی ہے۔ حسن اس کے بارے میں کبھی نہیں کہہ سکتا۔ منیہہ آپا کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ میں حسن سے پوچھتی ہوں۔“ میں تیزی سے دروازہ کی طرف لپکی۔ اسی سرعت سے بھائی جان نے میرا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔
”نور! منیہہ دودھ پیتی بچی ہیں۔ اس نے وہ

ی کہا جو حسن نے اسے کہنے کے لیے بھیجا تھا۔“ وہ پیار سے سمجھا رہے تھے۔

”نہیں۔۔۔ بھائی جان! ایسا نہیں ہو سکتا، میں مان ہی نہیں سکتی کہ حسن نے ایسا کہا ہوگا۔ آپ مجھے اس سے پوچھ لینے دیں۔“

”آپ کیا اس کی منتیں کرو گی؟“ بھائی جان نے صدمے سے کہا۔

”میں صرف ثابت کروں گی، اس نے کچھ نہیں کہا۔ ابھی وہ آپ کے سامنے آکر سب سچ بتائے گا۔ مجھے پوچھ لینے دیں اس سے۔“

بھائی جان نے جیسے مجبوراً ”میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں شکر گزاری سے انہیں دیکھتی دروازے کی طرف دوڑی۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں فاروق! نور کو روکیں۔ اب کس لیے جا رہی ہے اس گھٹیا آدمی کے پاس۔“ میں نے اپنے پیچھے بھابی کو کتے سنا۔

”جانے دو ماریہ۔۔۔ سترہ سال میں حسن نے اس کے گرد گمان کی عمارت کھڑی کی تھی حسن کے لفظ ہی اس عمارت کو گرا دیں گے۔ میری بہن کو ابھی بہت اذیت سہنا پڑے گی۔“ فاروق بھائی جان کی متاسف آواز نے میرا تعاقب کیا تھا۔



منیہہ آپا کے گھر تک ڈرائیو کر کے میں کس طرح صحیح سلامت پہنچی، میں نہیں جانتی۔ میرے دل و دماغ میں بے یقینی کے جھکڑ چل رہے تھے اور اس کشمکش کے زور سے سارا وجود لرزتا تھا۔

گیٹ منیہہ آپا کے چھوٹے بیٹے نے کھولا۔
”اسد! تمہارے حسن باموں گھر پر ہیں؟“ اسد نے ابھی گردن کو اثبات میں خفیف سی حرکت ہی دی تھی کہ میں تیزی سے اندر کی طرف لپکی۔

نی دی لاؤنج میں گھر کے سب ہی افراد موجود تھے۔ منیہہ آپا کے بچے اور شوہر نی دی دیکھ رہے تھے منیہہ آپا دوسرے کمرے سے نکل رہی تھیں۔ انہوں نے

نماز کے انداز میں دوپٹہ لپیٹا ہوا تھا اور ان کے ہاتھوں میں جائے نماز تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹھک کر رک گئیں، پھر تیزی سے میری طرف بڑھیں۔

”وہاں کیوں کھڑی ہو نور! اندر آؤ نا۔“ ان کی آنکھیں روئی ہوئی تھیں، لیکن وہ مسکراتے کی کوشش کر رہی تھیں اور ان کی گھبراہٹ چھپائے نہ چھپتی تھی۔

”حسن کہاں ہے منیہہ آپا؟“ میں نے بے قراری سے پوچھا۔

”حسن۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ گڑبڑا گئیں۔“

”آپ فاروق بھائی کے گھر گئی تھیں؟ آپ کیوں گئی تھیں آپا۔ آپ نے ان سے کیا کہا ہے؟ پتا ہے وہ کیا سمجھ رہے ہیں کہ حسن عفیوہ سے شادی کرنا چاہتا ہے غلط ہے نا منیہہ آپا؟ آپ نے جھوٹ کہا ہے نا؟“
”فاروق بھائی نے غلط بیانی نہیں کی۔ منیہہ آپا کو میں نے ہی ان کے پاس بھیجا تھا، کیونکہ میں تم سے نہیں عفیوہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اور مجھے یوں لگا جیسے دل کی دھڑکن یک دم ختم گئی ہو۔ میرے ارد گرد اتنا سناٹا چھا گیا جیسے میں اس کائنات میں تنہا رہ گئی ہوں۔

میں بے یقین ٹھٹھری ہوئی آنکھوں سے حسن کو دیکھ رہی تھی جو دوسری منزل کے زینے پر کھڑا تھا اور مجھ سے نظریں چرا رہا تھا۔

میں پتا نہیں کتنی دیر یوں ہی ساکت و صامت کھڑی رہی، پھر حسن آہستگی سے چلتا میرے قریب آیا اور اس نے میرا ہاتھ تھام کر سیڑھیوں کی جانب پیش رفت کی۔

”بس کرو حسن! خدا را بس کرو۔ کیوں کسی کی آہ لے رہے ہو۔“ منیہہ آپا نے کہتے ہوئے میرا ہاتھ چھڑوانے کی کوشش کی تھی، لیکن حسن نے نرمی سے ان کا ہاتھ ہٹا دیا۔

”مجھے نور سے بات کرنے دس منیہہ آپا! وہ اسی طرح میرا ہاتھ پکڑے مجھے اپنے کمرے میں لے آیا۔ میں ایک خوبی عمل کے تحت چلتی اس کے ساتھ آئی

تھی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے میرا ہاتھ چھو ڈیا اور ایک کرسی اٹھا کر میرے سامنے رکھ دی۔
”بیٹھ جاؤ نور!“ اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔
”تم میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو حسن۔“
میرے لبوں سے سسکی نکلی تھی۔

”تو یہ۔“ اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ اس نے میرے کندھوں پر اپنی ہتھیلیوں کا ہلکا سا بوجھ ڈال کر مجھے بٹھادیا پھر خود بھی بیڈ کے کنارے پر ٹک گیا۔

”پلیز نور! اب تم خاموش رہو، مجھے کہنے دو، میں نے بڑی مشکل سے کچھ کہنے کا حوصلہ اکٹھا کیا ہے۔ تم بہت اچھی ہو نور! اتنی اچھی عورت۔۔۔ میرا نہیں خیال دنیا میں اور کوئی ہو سکتی ہے۔ تم نے سترہ سال تک میرا بہت ساتھ دیا۔ میرے ہر اچھے برے وقت میں میرا ہاتھ بٹایا۔ تمہاری جگہ اگر میری بیوی ہوتی تو شاید وہ بھی اتنی مستقل مزاجی اور حوصلہ مندی سے میرا ساتھ نہیں دے سکتی تھی، جس طرح سے تم نے دیا اور صرف تم ہی نہیں تمہارے گھر والوں کے بھی مجھ پر بہت احسانات ہیں۔ احسان مندی اپنی جگہ، لیکن ان احسانات کا قرض چکانے کے لیے باقی کی ساری زندگی تمہیں خود پہ مسلط نہیں کر سکتا۔“

جھکی ہوئی نظروں اور شرمسار لہجے کے ساتھ اس کے جملے ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ۔ سن رہی تھی۔

”لیکن۔۔۔ تم کو تو۔۔۔ تمہیں تو محبت تھی مجھ سے۔“
میں نے یاد دلانا چاہا۔

”نہیں۔ مجھے تم سے محبت نہیں تھی نور! میں جس نور سے محبت کرتا تھا اس کی عمر سولہ سال تھی، تینتیس سال نہیں، اس نور کے چہرے پر معصومیت تھی، رعنائی تھی، دل فریبی تھی، پختگی نہیں، بے حسی کی حد تک سنجیدگی نے اس کے چہرے کو پتھر نہیں کیا تھا۔ میں نے جس چہرے سے محبت کی تھی۔ وہ ایک جوان چہرہ تھا نور! ذہلی ہوئی عمر کی کسی عورت کا بے رنگ چہرہ نہیں تھا۔“

”لیکن تم نے کہا تھا، میں بالکل نہیں بدلی۔“
”ہاں میں نے کہا تھا، کیونکہ اس وقت تک میں عفیوہ کو نہیں دیکھا تھا۔“ اس نے میرے اعصاب ایک اور حملہ کیا تھا۔

”تمہیں یاد ہے اس روز گفت شاپ میں اس کرشل ڈولز کو دیکھ کر تم نے کیا کہا تھا؟“
تم نے خود مجھے بہترین کو چنے کی ترغیب دی، نور! پھر بتاؤ میں تم سے شادی کرنے کی ہاں کیسے بھروں؟

جب میں نے ایئر پورٹ پر تمہیں دیکھا تو واقعہ سمجھا، وقت تو تم پر ٹھم چکا ہے، لیکن پھر اگلے روز میں نے عفیوہ کو دیکھا تو میں ٹھنک گیا۔ عفیوہ کی شکل میں مجھے وہ نور نظر آگئی تھی جس کی تصویر میں والٹ میں ہی نہیں اپنے دل میں بھی لگا کر لے گیا تھا۔ وہ تو کوئی اور عورت تھی جسے میں نے ایئر پورٹ پر دیکھا۔ پھر میں نے منیوہ آپا کو منع کر دیا کہ وہ ابھی شادی کی تاریخ کی بات فاروق بھائی سے نہ کریں۔ درحقیقت لاشعوری طور پر میں خود کو وقت دینا چاہ رہا تھا۔

پھر میں نے تم سے کہا؟ عفیوہ کی طرح ڈارک کلر پہنو، شاید میں تم پر عفیوہ کا عکس چڑھا کر اپنی تسکین کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اسی روز تم نے کسی بات پر عفیوہ کو ڈانٹ دیا۔ تب تم مجھے پہلی بار بری لگیں، میں نے سوچا تم اپنی ذہلی عمر کا بدلہ اس کی شخصیت سے رعنائی ختم کر کے لینا چاہتی ہو، لیکن گھر آکر میں پھر ڈبل مائنڈ ہو گیا۔ مجھے تمہاری جدوجہد، تمہاری قربانیاں یاد آنے لگیں۔ دل اور دماغ عفیوہ کی طرح گھنچ رہے تھے۔
ضمیر۔۔۔ ضمیر تمہارا نام لیوا تھا۔

صبح ہونے تک میرے دل و دماغ ضمیر کے سامنے سجدہ ریز ہو چکے تھے، لیکن تمہارے آفس میں جب میں تمہارے نام سے جانا گیا تو مجھے پھر اکتاہٹ محسوس ہونے لگی، مجھے لگا، سب سے متعارف کروا کے تم مجھے باؤنڈ کرنا چاہتی ہو۔

لیکن پھر اس گفت شاپ میں تمہاری باتیں سن کر

جیسے میری ساری کشمکش ختم ہو گئی۔ میں سوچتا تھا میرا دل و دماغ عفیوہ کی طرف کیوں کھینچا ہے تو مجھے اپنے ہر سوال کا جواب مل گیا۔ تم دراصل ریک میں رکھی گڑیا ہو، جس کی چمک ہر گزرتے سال نے کم کر کے بڑھاپے کی پرت جمادی ہے۔ جبکہ عفیوہ! اس کی چمک تم سے بہت زیادہ ہے، اس پر وقت کی گرد نہیں پڑی، نہ ہی ماہو سال کی مشقت نے اس کی شفاف رخ کو دھندلایا ہے۔

تو میں نے اسی دن طے کر لیا کہ مجھے بہتر چیز کے بجائے بہترین کا انتخاب کر لینا چاہیے۔ اب منیوہ آپا مجھ سے خفا ہیں، تم بتاؤ نور! میں نے کیا غلط کیا ہے؟ بہتر چیز اور بہترین چیز سامنے ہو تو بہترین کو چن لینا چاہیے، کیا تم نے نہیں کہا تھا؟“

میرا سر خود بخود اثبات میں ملنے لگا۔

”لیکن چیز“ اور انسان میں فرق ہوتا ہے حسن۔“
سکیوں کے بوجھ تلے دبے لفظ بدقت تمام میری زبان سے ادا ہوئے تھے۔

”ایک ہی بات ہے نور! بنیادی کلیہ تو وہ ہی ہے۔“
حسن نے تھکے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

”میں تم سے بہت شرمندہ ہوں نور! لیکن ایک بار تم خود کو میری جگہ پر رکھ کر سوچو۔ مجھے تمہاری جیسی کسی بوڑھی ہوئی لڑکی کے بجائے عفیوہ جیسی بھرپور لڑکی کی ضرورت ہے۔ تمہاری سنگت مجھے بھی بوڑھا کر دے گی۔ کبھی میں تھک کر بیٹھ گیا تو تم بھی تھک کر سستانے لگو گی، لیکن عفیوہ جیسی۔۔۔ زندگی کی رعنائیوں سے بھرپور لڑکی مجھے آگے بڑھنے کا شوق دے گی۔ مجھ پر تم نے بہت احسانات کیے ہیں، ایک اور احسان کرنا۔ تم سے شادی نہ کرنے کے فیصلے پر میرے سب اپنے مجھ سے خفا ہو گئے ہیں۔ میری بہنیں، میری بات سننے پر راضی ہی نہیں ہیں۔ ہو سکے تو میرا بھرم رکھ لیتا، یہ احسان بھی ساری زندگی یاد رکھوں گا۔“
حسن کے لہجے میں حقیقی شرمندگی تھی۔

☆ ☆ ☆

میں حسن کے کمرے سے نکلی تو میرے وجود سے

روح کو پرواز کیے پچیس منٹ گزر چکے تھے۔ حسن بن مدثر نے میری سترہ سال کی ریاضت کو چار دن پر کھنے کے بعد پچیس منٹ میں رد کر دیا تھا۔ (بس اتنی سی تھی میری اوقات) اس نے مجھے رد کر دیا تھا۔ میری محبت کو رد کر دیا تھا۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا حسن نے۔ میں بھرے ہاتھوں کے ساتھ اس سے جواب طلبی کرنے آئی تھی، خالی ہاتھ ہو کر جارہی تھی۔

مجھے پیڑھیاں اترنا دیکھ کر منیوہ آپا لپک کر میرے پاس آئی تھیں۔ انہوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی تھی، لیکن میں کس لیے رکتی۔ اب کیا فائدہ تھا اس بات کا۔

☆ ☆ ☆

بواجی نے سراٹھا کر دیکھا، پھر سر کے خفیف سے اشارے سے مجھے قریب آنے کے لیے کہا۔ میں چھوٹے چھوٹے مضحل۔ قدم اٹھاتی ان کے پاس جا کر بیٹھ گئی اور چپ چاپ خالی الذہنی سے ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ میرے اعصاب پر ایک بو جھل سی غنودگی پھیلی ہوئی تھی، جبکہ سارے چہرے پر آنسوؤں کے خشک نشانات کی وجہ سے کھنچاؤ محسوس ہوتا تھا۔

بواجی قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں۔ چند منٹ بعد انہوں نے رحل میں رکھے قرآن پاک میں نشانی لگا کر اسے بند کیا اور میرا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر میری پیشانی پر دم پڑھ کر پھونکنے لگیں، پھر انہوں نے میرا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔

بواجی کے شانے سے لگتے ہی میرے دل میں ٹھہرا غم پھر سے بہہ نکلا اور سینے میں سسکیاں ڈوبنے ابھرنے لگیں۔

”بس میرا بچہ۔۔۔ بس۔۔۔ مرد کی فطرت میں ہی دعا بازی ہے۔ ناقدرا ہوتا ہے مرد۔ نہ رو نور! اپنا حساب اللہ کے سپرد کر دے۔ وہ ہے ناسب کے کھاتے درست کرنے والا۔“

بواجی مجھے ساتھ لپٹائے دیر تک سمجھاتی رہیں، انہیں خبر نہیں تھی میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تو کل روح کے ساتھ ہی رخصت ہو چکی تھی۔

اور پھر یہ معمول بن گیا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ میرا غم بڑھتا چلا جاتا تھا۔ بواجی سارا سارا دن مجھے سمجھانے میں گزارتیں۔ دن تو خیر کسی نہ کسی طرح گزر جاتا رات میرے لیے قیامت ہوتی۔

بھوک پیاس کا احساس رفتہ رفتہ بالکل مٹا جا رہا تھا۔ بواجی مجبور کر کے مجھے کھانے کے لیے بٹھاتیں اور میں دیر تک یوں ہی پلیٹ سامنے رکھے بیٹھی رہتی اور ایک بھی نوالہ منہ میں ڈالے بغیر اٹھ جاتی۔

آئینہ دیکھنا میں نے چھوڑ دیا تھا، لیکن کبھی کبھار لاشعوری طور پر میں آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو جاتی اور دیر تک اپنے چہرے میں بڑھاپے کا سراغ لگانے کی کوشش کرتی رہتی۔

معا" آئینے کی سطح پر دھواں سا پھیل جاتا اور میرا عکس دھندلا جاتا۔ اور جو عکس نظر آتا اندر کو دھنسی ہوئی سیاہی زدہ آنکھیں، لٹکی ہوئی کمزور جلد، لاغر پن سے جھکے ہوئے کندھے اور ہاتھوں کی لٹکی ہوئی جلد میں سے ابھری ہوئی نیس۔

میری سسکیاں اور آہیں درودوار ہلانے لگتیں۔ میں پوری رات روتی رہتی اور دعا کرتی کہ جب دن طلوع ہو تو میرے اس بے روح، تینتیس برس کے بوڑھے وجود سے زندگی کی رمت ختم ہو چکی ہو۔

لاحاصل محبت۔ دراصل انسانی وجود کو ایک قبرستان بنادیتی ہے جس میں وہ اپنی تشنہ خواہشات اور نامکمل آرزوؤں کی قبریں اٹھائے پھرتا ہے۔

”عفیہ! تم سے شرمندہ ہے۔“ ماریہ بھابھی آئیں تو انہوں نے بتایا۔ ”اسے لگتا ہے جو کچھ تمہارے ساتھ حسن نے کیا اس کی ذمہ دار وہ ہے۔“

عفیہ پائل تھی۔ میری قسمت کی کارگزاری میں اس کا کیا تصور؟

”ہر تیسرے چوتھے ہفتے حسن کی بہنوں میں سے

کوئی نہ کوئی آجاتی ہے، فاروق کے پاس کہ ہمیں معاف کر دیں، حسن نے جو کیا اس کے لیے ہم شرمندہ ہیں۔ بتاؤ ایسی ہی شرمندگی ہے تو بھائی کے لیے لڑکیاں کیوں دیکھتی پھر رہی ہیں؟ اونہم۔۔۔ ساری ڈرامے بازی سب کی سب بڑی ہیں حسن سے۔ کان سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی لائیں اسے یہاں، تو کیا مجال تھی اس کی کہ معافی نہ مانگتا۔ میں تو سچی بات ہے جب بھی ان میں سے کوئی آتی ہے خوب باتیں سناتی ہوں۔ تم اور تمہارے بھائی اللہ جانے کس مٹی سے بنے ہو۔ میں کہتی ہوں نور! اتنا بھی صبر اچھا نہیں ہوتا۔ ایک بار حسن سے جھگڑا کرو اسے برا بھلا کہہ لو، کم سے کم تمہارا دل ہی ہلکا ہو جائے گا۔“

میں صم، صم، صم بھابھی کی باتیں سنتی رہی۔ کچھ کہنے کی تمنا تھی نہ حسرت، میں انہیں سمجھا ہی نہیں سکتی تھی کہ میرے دل میں صبر نہیں تھا سنا تھا۔ جو میری رگوں کو چیرتا تھا، وحشت میں مبتلا کرتا تھا، لیکن شور میں نہ ڈھلتا تھا اور اچھا ہی تھا۔ اب شور کر کے کیا اپنے گرد جمع اکٹھا کرتی۔

”اسی لیے میں بار بار حسن کو بلوانے پر اصرار کرتی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کی طرف سے ہمیشہ میرا دل خدشات کا شکار رہتا تھا اور دیکھ لو، میرے خدشات غلط ثابت نہیں ہوئے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مرد کی ذات بڑی ہی ناقابل بھروسہ ہوتی ہے اور پھر ایسا مرد جو سترہ سال سے تمہارہ رہا ہو۔“

بھابھی کہہ رہی تھیں میں انہیں بتانہ سکی، نمل بھی یہی کہتی ہے اور آپ سے نہیں ہمیشہ سے ابھی چند روز قبل آئی تو کہہ رہی تھی۔

”اب تو مان ہی لو نور! کہ مرد بے وفا ہوتا ہے۔“ وہ ہر بار آتی اور میرے غم میں شریک ہوتی۔

”حسن کو پہلی بار دیکھتے ہی میں کھٹک گئی تھی۔ وہ جس طرح عفیہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جو کچھ تھا وہ ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ مجھے البتہ حیرانی ضرور ہوئی تھی کہ جو محسوس کر رہی ہوں وہ تم نے کیوں نہیں دیکھا۔ پھر میں نے سوچا، ضرور مجھے غلط

فہمی ہوئی ہوگی۔ سترہ سال کے ریلیشن شپ میں کوئی اتنا بڑا دھوکہ نہیں کر سکتا۔ بلیوی نور! پہلی بار میں نے سوچا کہ میں جو ہر وقت کہتی رہتی ہو مرد ناقابل بھروسہ ہوتا ہے تو میں غلط ثابت ہو جاؤں اور مجھے افسوس ہے، میں ہی سچ ثابت ہوئی۔“

وہ جو ہمیشہ میرے پاس اپنے دکھڑے رونے آتی تھی اب میرے دکھ سے بغیر ہی مجھ سے ہمدردی جتاتی رخصت ہو جاتی۔ آذر بھی اکثر آجاتا لطیفے سنا کر مجھے ہنسانے کی کوشش کرتا۔ اسکول، کالج کے قصے دہرا کر میرا دل ہلانے کی کوششوں میں لگا رہتا۔

دن پر دن گزرتے رہے۔ میں دنیا سے منہ چھپا کر پڑی رہتی۔ آفس جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اس روز میری کولیک سارہ کافون آگیا۔

”تم کہاں غائب ہو نور! تمہیں ذرا بھی اندازہ ہے تمہاری لاپرواہی تمہیں کتنی بڑی مشکل میں ڈال سکتی ہے۔ انکوائری والے پہلے ہی کسی ایسپلائی کی ذرا سی غلطی کی تلاش میں ہیں کہ جیسے ہی کوئی کمزوری دکھائے اس پر کیس بنادیا جائے وغیرہ وغیرہ۔“

ناچار اگلے روز سے مجھے آفس جانا پڑا۔ کچھ انکوائری کمیشن کارڈ کچھ اس بے روح جسم کی طبی موت سے پہلے کی کچھ ضروریات تھیں جنہیں بہر حال مجھے ہی پورا کرنا تھا۔ میری برپادی کی داستان کسی نہ کسی طرح یہاں بھی پہنچ ہی چکی تھی رہی سہی کسر میری اجڑی ہوئی حالت نے پوری کر دی۔

میری شادی کے اچانک ملتوی ہو جانے سے یہاں سب کے ذہنوں میں سوال اٹھ رہے تھے میری بچھی ہوئی آنکھوں نے سب سوالوں کے جواب دے دیے۔ جنہیں پھر بھی کچھ شبہ رہ گیا تھا براہ راست پوچھنے لگے۔ میں کبھی حوصلہ مندی سے جواب دے دیتی۔ کبھی خاموشی سے ٹال دیتی۔ لیکن جینا اب اور مشکل لگنے لگا تھا۔

بعض اوقات بھرم قائم رکھنا زندگی کا مشکل ترین کام بن جاتا ہے۔ میری زندگی کا یہ مشکل ترین دور تھا۔

پھر کب تک کوئی میرے غم میں شریک ہونے کے لیے اپنے اپنے کاروبار زندگی چھوڑ کر بیٹھ سکتا تھا، سب اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف ہونے لگے۔ صرف میں تھی جو مصروفیت کے باوجود بولائی بولائی پھرتی۔

پھر ایک روز میں نے بینک کی پارکنگ میں باسٹ کو دیکھا تو وہیں سے گاڑی واپس موڑ لی۔ اس بھلے آدمی سے مل کر میں اسے آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ جانتی تھی بینک میں اس کے اتنے واقف کار تھے کوئی نہ کوئی اسے میرے پارے میں بتا ہی دیتا۔

پھر وہی ہمدردی، پھر وہی تسلیاں اور بالا خرہ ہمدردی میں اٹھایا ہوا ایک قدم جو وہ پہلے پسندیدگی میں اٹھا چکا تھا اور یہ ہی نہیں چاہتی تھی۔ آج سے چند سال بعد اگر باسٹ بھی مجھے وہی کہہ کر چھوڑ دیتا جو حسن نے کہا تھا تو میں کیا کر لیتی۔

غم نے مجھے پاگل ہی نہیں وہی بھی بنادیا تھا۔ لیکن باسٹ کو دیکھ کر مجھے وہ دو تین مرد اور یاد آگئے جنہوں نے کبھی نہ کبھی میری طرف پیش قدمی کی کوشش کی تھی اور میں نے انہیں ویسے ہی مایوس کر دیا تھا جیسے باسٹ کو کیا تھا۔ میں ہمیشہ حسن کی پابند رہی تھی، حتیٰ کہ میں نے اپنے خیالات تک میں کسی دوسرے مرد کو دخل اندازی کی اجازت نہ دی تھی پھر بھی حسن نے مجھے چھوڑ دیا۔

میں دیر تک سڑکوں پر گاڑی دوڑاتی رہی، پھر گھر آئی تو فاروق بھائی اور ماریہ بھابھی آئے بیٹھے تھے۔ چند ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بھابھی نے اصل قصہ چھیڑا۔ وہ بہت چھان پھٹک کر میرے لیے کوئی رشتہ لائی تھیں۔

”میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا، بھابھی! میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔“ میں نے دو ٹوک کہا۔

”کیوں نہیں کرنا چاہتیں؟“ بھابھی نے ترنت پوچھا۔

”اس خود غرض انسان کے لیے کب تک اپنی زندگی برباد کروگی؟ ابھی تو وقت تمہارے ہاتھ میں ہے اسے بھی تو پتا چلے اگر اسے تمہاری پروا نہیں تھی تو تمہیں بھی نہیں ہے۔“ میں گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

”اب یہ ہی دیکھ لو تم تو اس کا جوگ لیے بیٹھی ہو اور وہ محض پانچ مہینوں کے اندر اندر دو سری لڑکی تلاش کر کے آج ہی منگنی بھی کروا رہا ہے۔“ بھابھی کی آواز نے جیسے مجھے کسی کنویں میں دھکیل دیا تھا۔

”مار یہ!“ بھائی جان نے بھابھی کو خاموش کروانا چاہا مگر بھابھی بولتی رہیں۔

”پلیز فاروق! مجھے خاموش ہونے کا نہ کہیں تو اچھا ہوگا۔ اسے بھی تو پتا چلے دیں جس کے لیے اپنی زندگی کے یہ قیمتی سال بھی گنوا رہی ہے۔“

بھابھی بولتی رہیں، میں خلا میں معلق خود کو بچانے کے لیے ہاتھ پیر بھی نہ چلا سکی، پھر اس روز رات گئے دیر تک میں خالی خالی نظروں سے چھت کو گھورتی رہی۔

آج وہ کسی اور کا ہونے جا رہا تھا، اور یہ احساس میرے ایک ایک عضو کو کند آری سے کاٹ رہا تھا۔

اس رات میں پھر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی، پھر میرا عکس ابھرا۔ ایک بار پھر دھواں پھیلا اور جب چھٹا تو اذیت کی ایک تیز لہر میرے پورے جسم میں گردش کرتی دماغ تک پہنچ گئی، ہوش و خرد سے بے گانہ ہونے سے محض ایک لمحہ پہلے میں نے اللہ سے بڑی شدت سے دعا کی تھی۔

”اے اللہ! اب مجھے قیامت تک بے دار نہ ہونے دینا۔“



اسپتال میں پڑے مجھے نواں دن تھا، اس رات نروس بریک ڈاؤن ہونے کی وجہ سے میں اگلے دو روز بے ہوش رہی اور پھر بالآخر زندہ بچ گئی۔ پتا نہیں میرے اعصاب اتنے مضبوط کیسے تھے۔

اسپتال میں میرے پاس عیادت کرنے والوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا۔ وہ سب میری ہمدردی میں آرہے تھے، لیکن میرا دل کسی کی شکل دیکھنے کو نہ چاہتا۔ پھر وہ ہی ہمدردی، پھر وہ ہی ترس، نئی زندگی شروع کرنے کی صلاح اور آخر میں حسن جیسے خود غرض کو بھولنے کی

ناکید۔

پھر اسی روز ایک عجیب بات ہوئی، ایسی بات جس کی شدت سے خواہش مند ہونے کے باوجود میں توقع نہیں کر رہی تھی۔

حسن مجھ سے ملنے اسپتال چلا آیا۔

اس وقت میں کمرے میں تنہا تھی۔ فلک چند گھنٹے بعد آنے کا کہہ کر اپنے گھر گئی ہوئی تھی۔ مسکن ادویات کی وجہ سے میرا ذہن بار بار غنودگی میں چلا جاتا اور بار بار ہڑبڑا کر بے دار ہوتا تھا، معاً اس نیم غنودہ کیفیت میں مجھے کچھ عجیب سا احساس ہوا تو میں نے آہستگی سے آنکھیں کھول دیں اور اگلے ہی پل ہڑبڑا کر سیدھی ہو بیٹھی۔ حسن بیڈ کے پائنتی کی جانب کھڑا بغور مجھے دیکھ رہا تھا۔

میرے ہاتھ پر کینولا کی مدد سے ڈرپ لگی ہوئی تھی، اس طرح اچانک اٹھ کر بیٹھنے سے ہاتھ میں زبردست کھنچاؤ پیدا ہوا اور تکلیف کی تیز لہر میرے سارے بازو میں دوڑ گئی، لیکن تکلیف کے ہر احساس سے بے نیاز ہو کر میں یک ٹک حسن کو دیکھ رہی تھی۔

”تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“

میرے پاس اس کے لہجے سے جھلکتی سرد مہری کو محسوس کرنے کی صلاحیت تھی، نہ اس کے سوال کا جواب دینے کے لیے الفاظ کہ میری آنکھوں سے بری طرح آنسو بہنا شروع ہو گئے تھے۔

”اس طرح مت روؤ نویر!“ اس نے مجھے روتے دیکھ کر کہا۔

”تمہارے آنسو، دنیا کی طرح مجھے بھی تمہاری ہمدردی میں ضرور مبتلا کر سکتے ہیں، لیکن تمہارے حق میں قائل نہیں کر سکتے۔“

یک دم اس نے میرے سر پر ہتھوڑا کھینچ مارا تھا۔

”میں نے تم سے گزارش کی تھی نویر! میرا بھرم رکھ لینا اور تم نے کیا کیا؟ ساری دنیا کے سامنے میرا تماشا لگا کر رکھ دیا۔ میں نے سب کچھ تو تمہیں بتا دیا تھا، سب کچھ سمجھانے کی کوشش کی تھی، مگر تم۔ تمہیں شوق ہے سب کی ہمدردیاں بٹورنے کا۔“ اس نے آتشی لہجے

اور بے زاری سے کہا تھا۔

”مجھے کسی کی ہمدردی نہیں چاہیے حسن! مجھے تم چاہیے ہو۔“ میں نے روتے ہوئے کہا۔ ”مجھے پانچ مہینوں سے میں خود کو سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ تم میری قسمت میں نہیں ہو، مجھے تم کو بھولنے کی کوشش کرنا چاہیے، مگر میرا دل نہیں سمجھتا، خدا کے واسطے، میرے ساتھ یوں نہ کرو، مجھے مت نکالو اپنی زندگی سے، مراؤں گی میں تمہارے بغیر۔“

میں محض رو نہیں رہی تھی، میں بلک رہی تھی، میں اس کی منتیں کر رہی تھی، یہ دیکھے بغیر کہ حسن کی نظروں میں میرے لیے محبت تھی، نہ ہمدردی، ہاں اکٹا ہٹ تھی، بے زاری تھی۔

”کوئی کسی کے بغیر نہیں مرتا، لی پریشیکل نویر!“ اس نے چپچپے ہوئے کہا۔ ”اور رونا بند کرو تم کوئی مین ایجر امپجور لڑکی نہیں ہو کہ کسی کے نہ ملنے پر مرنے مارنے کی باتیں کرو۔“

”مین ایجر نہیں ہوں، امپجور نہیں ہوں، لیکن کیا میرے پاس دل بھی نہیں ہے؟ عمر بڑھ جانے سے کیا دل کی ضروریات ختم ہو جاتی ہیں؟“ میں جرح کرنے لگی۔

”دل کی ضرورت ختم ہو یا نہ ہو، لیکن مرد کو صرف عورت کا دل نہیں چاہیے ہوتا اس کی کچھ اور ترجیحات ہوتی ہیں کچھ اور ضروریات ہوتی ہیں جو ایک ذہلتی عمر کی عورت پوری نہیں کر سکتی۔“ یک دم حسن نے ٹھہرے ہوئے سرد اور معنی خیز لہجے میں کہا تھا۔

میں چپ کی چپ رہ گئی، لیکن حسن چپ نہیں ہوا وہ بولتا چلا گیا اور پھر اس نے میرے سامنے وہ ساری تفصیلات بیان کیں جو ان سترہ سالوں میں اس نے بہت چھان پھٹک کر جمع کی تھیں اور جن میں ایشیا خصوصاً پاکستانی عورت کی اپور تاج عمر اور صحت مندی کے متعلق اتنا لمبا ایسا بیان تھا کہ میرا دل چاہا زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔

”شادی ہی زندگی میں خوشیوں کی علامت نہیں ہوتی، کچھ اور چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ میں ابھی ترس

کھا کر تم سے شادی کر لوں اور چند سال بعد مجھے اپنے فیصلے پر افسوس ہو تو کیا ہوگا؟ تم ابھی بیستیس سال کی ہو۔ میں تم سے کہوں اگلے کچھ سالوں تک میں فیملی اشارت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تو کیا چند سال بعد مجھے صحت مند اولاد دینے کے قاتل ہوگی؟ یہ سترہ سال تمہیں پتا ہے نویر! میں نے کس طرح گزارے ہیں۔ میں نے اپنے قدموں کو کسی غلط راستے پر بڑھنے نہیں دیا۔ کیا اتنی احتیاط بھری زندگی گزارنے کا صلہ یہ ہے کہ مجھے ایک بوڑھی ہوتی عورت مل جائے اور چند سال بعد جب وہ میری ضروریات پوری کرنے کے قاتل نہ رہے تو مجھے غیر اخلاقی راستے تلاش کرنا پڑیں۔ آئی ایم سو ری نویر! سترہ سال تک میری ہمدردی تمہاری اپنی چوائس تھی میں نے تمہیں کبھی مجبور نہیں کیا تھا۔ اب ان احسانات کے بدلے میں اپنی پوری زندگی نہیں دے سکتا تمہیں۔ چند روز پہلے میں نے منگنی کر لی ہے۔ فاروق بھائی کا خیال تھا۔ وہ مجھے عفیوہ کا ہاتھ نہیں دیں گے تو کوئی اور لڑکی بھی نہیں ملے گی مجھے۔ میں اپنی منگیتر کو ان سے ضرور ملواؤں گا۔ تاکہ ان کا گھمنڈ ختم ہو سکے۔ میں جانتا ہوں میں نے تمہیں بہت ہرٹ کیا ہے۔ لیکن سترہ سال میں نے اپنی بہنوں کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے چکر میں اپنی خوشیوں سے منہ موڑے رکھا۔ اب تمہارا احسان چکانے کے چکر میں پھر اپنے دل کی خوشی چھوڑ دوں تو اپنی پسند کی زندگی کب گزاروں گا میں۔ چلتا ہوں امید ہے تم نے کھلے دل اور کھلے ذہن سے سب باتوں کو تسلیم کر لیا ہوگا۔ ٹیک کیمر نویر!“

دروازہ کھلا پھر بند ہو گیا اور میرے ارد گرد سناٹا پھیل گیا۔ پتا نہیں یہ سناٹا زیادہ گہمیر تھا یا وہ سناٹا جو پہلی بار حسن کے منہ سے اپنے ٹھکرائے جانے کا انکشاف سن کر میرے چاروں جانب پھیل گیا تھا۔

پتا نہیں میں کتنی دیر ایسے ہی بیٹھی رہی۔ میری حالت ایک ایسے انسان کی سی ہو رہی تھی جو کسی بلند عمارت کی سب سے آخری منزل سے منہ کے بل زمین پر گرا ہو، لیکن جسم میں جان بقی ہو اور تکلیف

کی شدت سانس بھی نہ لینے دیتی ہو۔ تب ہی میں نے سنا کوئی میرا نام لے کر پکار رہا تھا۔ میں نے دیکھا وہ آذر تھا جو میرا سر ہلاتے ہوئے پریشان نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

”نور! کیا ہوا ہے تمہیں۔ اس طرح کیوں بیٹھی ہو۔ طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟“ مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ کچھ مطمئن ہوا۔

”فلک نے فون کر کے کہا تھا تمہارے لیے کھانا لے جاؤں؟“ اس نے میرے سامنے ٹیبل سیٹ کرتے ہوئے کہا۔

”نور! میں نے ابھی حسن کو جاتے ہوئے دیکھا“ اس نے کچھ کہا تم سے؟“

وہ جھجکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ میری آنکھ سے ایک آنسو تیزی سے بہہ نکلا۔ آذر گہری سانس بھرتا بیڈ کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ کر حسب معمول مجھے سمجھانے لگا۔ وہ ہی سب باتیں دہرانے لگا جو سب سمجھاتے تھے۔

”حسن کو بھول جاؤ وہ تم جیسی اچھی لڑکی کے قابل نہیں تھا۔ برا وقت جو گزر چکا۔ زندگی میں اور کچھ بھول جاؤ سب آسان ہے وغیرہ وغیرہ۔“

میں جواب تک یہ سوچ رہی تھی اگر حسن کی تھوڑی سی منت سماجت کر لی ہوتی تو یقیناً وہ مجھے چھوڑنے کا فیصلہ بدل دیتا تو اب میرے پاس ایسی کوئی بھی امید باقی نہیں رہی تھی۔ میں بری طرح لہو لہان تھی اس پر سے آذر کی فہم بھتیجی۔ میرا دل غ بھک سے اڑ گیا اور میں اسی پر برس پڑی۔

”کہنا بہت آسان ہوتا ہے، سہنا مشکل، جسے دیکھو مجھے سمجھانے چلا آ رہا ہے، تمہیں کیا پتا آذر ٹھکرائے جانے کی اذیت کیا ہوتی ہے؟ سیلف ریسپیکٹ ہرٹ ہوتی ہے تو کیسا لگتا ہے، نمل نے تمہارے ساتھ وہی کیا ہوتا جو حسن نے میرے ساتھ کیا تو میں بھی پوچھتی تم انہا دکھ کیسے چھپاتے ہو، تم جاؤ یہاں سے آذر مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔“

میں نے ہاتھ مار کر ڈرپ نکال دی۔ ڈرپ اسٹینڈ

کر گیا۔ پھر میں بے بس ہو کر خود ہی رونے بیٹھ گئی۔ آذر خاموشی سے بکھرا ہوا سامان سمیٹنے لگا۔

اس روز منہ ذہ آپا کے مکان کی آخری انٹالمنٹ کا فارم بھرتے ہوئے میری آنکھوں کے کنارے جلنے لگے تھے۔

”تنی محنت، اتنی جدوجہد کس کے لیے کی تھی میں نے؟“

میری آنکھوں میں جلن بڑھنے لگی تھی، نا صرف آنکھوں کی جلن بڑھ گئی تھی بلکہ سر بھی درد سے پھٹنے والا ہو رہا تھا۔ میں سارہ سے فارم بھرنے کا کہہ کر میز پر سے اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔ گیارہ مہینے کے بعد اب آنسو بہنا بند ہو چکے تھے۔

”نور! تم نے سنا زارا کی منگنی ہو گئی ہے۔ یہ عنقریب ہمیں ٹریٹ دے گی۔“ سارہ نے فارم مجھے واپس پکڑاتے ہوئے بتایا۔

”چھالے مبارک۔“ میں نے زارا کی طرف دیکھتے ہوئے فارم فائل میں لگا دیا۔

”شادی کب تک ہوگی زارا؟“ سارہ نے ہی پوچھا۔

”تین سال تک تو بھی شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ عید کہہ رہا تھا جب تک اس کی ملازمت مستقل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی بہنوں کی شادی نہیں ہو جاتی، وہ شادی نہیں کرے گا۔“ زارا نے تفصیل سے بتایا۔

”تین سال میں اس کی بہنوں کی شادیاں ہو جائیں گی اس بات کی کیا گارنٹی ہے؟“ سارہ نے پھر پوچھا۔

”امید پر دنیا قائم ہے یا ر!“ زارا نے ہنس کر کہا۔ میں بے دھیانی میں اس کا چمکتا ہوا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ میرا دل چلا اس سے کہوں کسی مرد پر بھروسہ کر کے دھوکہ مت کھانا۔ مرد اس قابل نہیں ہوتا کہ اس پر بھروسہ کیا جائے۔

”تمہیں بہت مبارک ہو زارا! میں دعا کروں گی اللہ تمہیں بہت خوشیوں دے۔“ میں نے پرس کندھے پر

ڈالتے ہوئے کہا۔

”تمہیں کیا ضرورت تھی نور کو میری منگنی کے بارے میں بتانے کی؟“ کیبن کی سائیڈ سے نکلتے ہوئے میں نے زارا کی سرگوشی سنی تھی۔

”میرے بارے میں سن کر اس بے چاری کا دل کتنا خراب ہوا ہوگا۔“

میرا دل اور بو جھل ہو گیا۔ یہ ترس اور ہمدردی بھرے جملے جیسے میری جان کا عذاب ہی بن گئے تھے۔ مینجر صاحب کو اپنے جانے کا پتا کر میں گھر آ گئی۔ بوا جی عصر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھیں، مجھے اتنی جلدی گھر میں دیکھ کر حیران ہوئیں۔

”آفس میں کام نہیں تھا بوا جی! اسی لیے آ گئی۔“ میں نے کہا بوا جی کو اتنے دنوں میں میرے جھوٹ سننے کی عادت ہو گئی تھی۔ اثبات میں سر ہلا کر بولیں۔

”تم بھی نماز پڑھ لو، پھر میں چائے بنا دیتی ہوں۔“ میں سر ہلا کر کمرے میں آ گئی اور نماز ادا کر کے لاؤنج میں آ بیٹھی بوا جی کچن میں تھیں۔

میری زندگی عجیب ڈھب پر چل پڑی تھی۔ حسن کو میں یاد نہیں کرتی تھی، البتہ اس کی باتیں بھلائے نہ بھولتیں۔ اچھا برا لگنے کی تو اب بات ہی نہ تھی۔ عجیب سی سرد مہری مجھے گھیرے رکھتی۔ سر میں درد اتار رہا تھا کہ دل چاہتا سر پر پتھر باندھ لوں۔ نیند بھی بمشکل دو یا تین گھنٹے آتی۔ بوا جی کہتیں چلو ڈاکٹر کے پاس چلو۔ لیکن میں جانتی تھی ڈاکٹر کے پاس میرا علاج نہیں تھا جس کے پاس تھا وہ اپنی پسند کے مطابق کم عمر لڑکی سے شادی کر کے اور اپنا گھر سا کرچین و راحت کی ہنسی بجا رہا تھا۔ منگنی کی خبر سن کر میں جس شکست و ریخت کا شکار ہوئی تھی شادی کی خبر سن کر ایسا کچھ بھی نہ ہوا، شاید اس لیے کیونکہ مجھے یقین آچکا تھا جب مرد دل کے جذبات سے زیادہ جسم کی ضروریات کی بات کرنے لگے تو پھر اسے دنیا کی کوئی منت سماجت قابل نہیں کر سکتی۔

بوا جی میرے پاس آکر بیٹھیں تو چائے کے کپ کے ساتھ فریج فرائز کی پلیٹ بھی تھی۔ وہ مجھ سے

کھانے کے لیے اصرار کرنے لگیں۔ میں نے بھوک نہ ہونے کے باوجود ان کی بات مان لی۔

تب ہی میری نظر ٹیبل پر پڑے اخبارات کے نیچے دے سنہرے لفافے پر پڑی۔ میری نظروں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے بوا جی نے سر ہاتھ مارا۔

”بتاؤ۔۔۔ یہ تو میں تمہیں دینا ہی بھول گئی۔“ انہوں نے لفافہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

”تین روز پہلے نمل کی شادی کا کارڈ دے گئی تھی۔ یہاں اخباروں میں ہی دوبارہ گیا۔“

”نمل کی شادی کا کارڈ۔“ میں حیران ہوئی، میری کئی روز سے اس سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔

”آذر اور نمل شادی کر رہے ہیں، کسی نے مجھے بتایا ہی نہیں، پرسوں آذر آیا ہوا تھا، اس نے بھی اشارہ کرنا۔“

”آنا، فانا، تو شادی نہیں ہو رہی نا۔“

گیارہ مہینے کی بددلی میں ذرا سی خوشی کی دیا سلائی چمکی بھی تو اس خیال سے فوراً ”مجھ گئی کہ وہ دونوں بھی زارا کی طرح اپنی خوشیوں کو میری بد نظری سے بچانا چاہ رہے ہوں گے۔“

”تم سے کس نے کہا آذر کی بھی شادی ہے۔ بھی یہ صرف نمل کی شادی کا کارڈ ہے۔“ بوا جی نے

بے زاری سے کہا، میں حیران پریشان کارڈ کھول چکی تھی اور ہرے رنگ کے کارڈ پر سنہری حروف میں نمل کے ساتھ لیتھ احمد کا نام دیکھ کر میں بالکل دنگ رہ گئی تھی۔ ”مجھے کئی مہینوں سے تم تو دنیا سے کٹ کر بیٹھی ہو نور! تمہیں کچھ بھی نہیں پتا یہ بھی نہیں کہ ساڑھے پانچ ماہ پہلے آذر اور نمل کی منگنی ختم ہو گئی تھی۔ اور اس کے فوراً بعد نمل نے کہیں اور منگنی کروالی تھی۔“

جن دنوں تم اسپتال میں تھیں یہ اس سے کچھ روز پہلے کی بات ہے۔ بے چاری شارقہ تو بہت پریشان رہی۔“

بوا جی مسلسل میرے سر پر انکشافات کے گولے برسا رہی تھیں اور میں ہکا بکا کبھی انہیں تو کبھی ہاتھ میں پکڑے اس کارڈ کو دیکھتی رہی جس پر چمکتے الفاظ

میں نمل اور لیتق احمد کا نام لکھا تھا۔

”ہم تو عجیب مشکل میں پھنس گئے ہیں، سمجھ ہی نہیں آ رہا، لیتق ماموں کی بھانجیوں کے طور پر شادی میں شرکت کریں یا نمل باجی کی بہنوں کے طور پر۔“

واپسی پر نمل کی چھوٹی بہن مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی تھی اور مسلسل چمک رہی تھی۔

”چھانور باجی! آپ نمل باجی کے مایوں میں تو شرکت نہیں کر رہیں، لیکن شادی میں تو آئیں گی نا؟“ جس وقت میں اپنی گاڑی کا لاک کھول رہی تھی اس نے مجھ سے پوچھا۔ اسی طرح کے سوال پر میں نمل کو انکار کر آئی تھی، لیکن اس کی بہن کو میں نے گول مول سا جواب دیا اور کار اشارت کر کے گڑھی شاہو کی تنگ گلیاں عبور کرنے لگی۔

جب میں نمل سے ملنے آ رہی تھی تو بے یقین تھی اور واپسی کے اس سفر میں میرا ذہن خالی ہو چکا تھا۔ میرے پاس سوچنے، حیران ہونے یا بے یقین ہونے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ نمل نے میرے ذہن سے ہر سوچ کو کھرچ ڈالا تھا۔

”زندگی میں بعض فیصلے کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، تم اندازہ نہیں لگا سکتیں نور! لیتق سے شادی کا فیصلہ میں نے کس قدر سوچ بچار کے بعد کیا ہے۔“

میرے استفسار پر نمل نے کہا تھا وہ مایوں کے زرد جوڑے میں ملبوس تھی اور جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ اچھی خاصی شرمسار دکھائی دیتی تھی۔

”انتاہی مشکل تھا تو کیوں کیا یہ فیصلہ؟ تمہیں ذرا بھی اندازہ ہے نمل تم آذر کے ساتھ کتنی نا انصافی کر رہی ہو، محبت کرتا ہے وہ تم سے، تمہیں کوئی حق نہیں ہے کہ اس کے ساتھ ایسا کرو۔“ میں نے بے حد غصے میں کہا تھا۔

”تویر! اس انداز میں تو آذر نے بھی مجھ سے سوال نہیں کیا، جس طرح تم کر رہی ہو۔“ نمل نے تعجب سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں تم سے اس لیے پوچھ رہی ہوں کیونکہ میں اس کیفیت سے گزری ہوں جس سے آذر گزر رہا ہوگا؟ روکیا جانا کتنا تکلیف دہ عمل ہوتا ہے، تم نہیں سمجھ سکتیں، لیکن میں جانتی ہوں خدا را آذر کے ساتھ وہ نہ کرو جو حسن نے میرے ساتھ کیا۔“ میں نے اس کے سامنے گڑ گڑاتے ہوئے کہا تھا۔

”پلیز مجھے حسن کے ساتھ کمپیئر مت کرو۔“ نمل نے درشتی سے کہا۔

”میں آذر کے ساتھ وہ نہیں کر رہی جو حسن نے تمہارے ساتھ کیا۔ میرا اور آذر کا کیس تو تمہارے معاملے سے بالکل مختلف ہے، تمہیں شاید یہ نہیں پتا کہ آذر نے مجھے اپنا راستہ الگ کرنے کی اجازت خود دی ہے، ہم نے یہی خوشی ایک دوسرے کو ملنے کی انگوٹھیاں واپس کی تھیں اور تمہیں تو شاید یہ بھی نہیں پتا کہ آذر کی جائیداد پر اس کی ساری برابری پر اس کے چچا کے بیٹے قبضہ کر چکے ہیں اور وہ بالکل کنٹرول ہو چکا ہے۔“

نمل نے ایک ساتھ میرے سر پر انکشاف کے دو گولے برسائے تھے۔

”تو کیا تم نے آذر سے اس کی دولت اور روپے پیسے کے لیے محبت کی تھی؟“ چند منٹ بعد میں نے صدے کی کیفیت میں پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ گہری سانس بھر کر بولی۔ ”میں نے اس کی دولت کے لیے محبت نہیں کی تھی، لیکن میرے لیے وہ ایک پرفیکٹ چوائس ضرور تھا۔ خوش شکل، باکروار اور دولت مند، اس میں ایسی کوئی خامی نہیں تھی کہ اس سے محبت نہ کی جاتی۔ اسی لیے میں نے اس سے محبت کی، لیکن اب میں سوچتی ہوں نور! صرف محبت کی خاطر تو میں اسے خود پر مسلط نہیں کر سکتی۔ اس جیسے کنجلی کے ساتھ رہتے ہوئے کل کو جب مجھے اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات کے لیے ترسنا پڑے گا تو میں کیا کروں گی اس محبت کا۔“ بے حد بے درد لگی تھی وہ اس وقت مجھے۔

”محبت صرف نہیں ہوتی نمل! میں نے دکھ سے

کہا تھا۔

”محبت پھر کیا ہوتی ہے؟“ نمل نے دوبارہ کہا۔

”میں تمہیں بتاؤں نور! محبت اس دنیا کی سب سے بے کار چیز ہے، محبت آپ کا پیٹ نہیں بھر سکتی، بیماری میں دوا کی نہیں دے سکتی، کمپری میں سر پر چھت فراہم نہیں کر سکتی۔ اچھے کپڑے، اچھی ضروریات زندگی نہیں دے سکتی، پھر کیا فائدہ ہے ایسی محبت کا؟“

اس نے طنز انداز میں پوچھا۔

”اگر محبت اتنی ہی بے کار چیز ہوتی ہے تو اتنے عرصے سے تم آذر کو محبت کے نام پر دھوکہ کیوں دے رہی تھیں۔“

”نہیں دھوکا نہیں دیا میں نے۔ مجھے سچ آذر سے محبت ہے سچی اور خالص محبت۔ اس کا دل دکھانے کے خیال سے مجھے بھی تکلیف ہوتی ہے لیکن پیسہ محبت سے بھی زیادہ ضروری ہوتا ہے وقتی طور پر نہیں ساری زندگی کے لیے۔ جب اس نے مجھے بتایا کہ اس کی برابری پر اس کے چچا کے بیٹوں نے قبضہ کر لیا ہے تو میں نے سوچا۔ اس کے پاس ایک زبردست ملازمت تو ہے۔ کسی ملٹی نیشنل کمپنی کی اتنی اچھی پوسٹ پر ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی لیکن اپنی عقل کے ہاتھوں اس نے وہ پوسٹ بھی گنوا دی۔ میں نے اس سے کہا تھا باورچی مت بنو لیکن اس نے میری ایک نہیں مانی۔ کمپنی نے اسے ہٹا دیا کیونکہ اس سے ان کی گڈول متاثر ہوتی تھی۔ اور آذر یہ رول جانتا تھا پھر بھی اس نے یہ کیا۔“

”ٹھیک ہے میں تمہارا سارا بوائنٹ آف پو سمجھ گئی۔ دولت کبھی بھی آسکتی تھی لیکن محبت۔ تمہیں آذر ہمیشہ بہترین لگتا تھا نمل۔ میں نے تیزی سے یاد دلایا۔

”ہاں وہ مجھے بہترین لگتا تھا تب تک جب تک میں لیتق سے نہیں ملی تھی۔“ اس نے نمل سے کہا۔

”میں نے ایک بات بہت بچپن میں سیکھ لی تھی نور! زندگی جب بھی آپ کو دو چیزوں میں سے ایک چیز چننے کا موقع دے تو وہ چیز چننا چاہیے جو Excellent

(بہترین) ہو۔ آذر میرے لیے بہتر تھا لیکن لیتق Excellent ہے ہاں ٹھیک ہے اس کے پاس آذر کی طرح اچھی شکل و صورت نہیں ہے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے شکل و صورت کو تو ایک نہ ایک دن ڈھلنا ہی ہوتا ہے۔ لیتق کے پاس دولت ہے کاروبار ہے۔ وہ میری ہر خواہش پوری کر سکتا ہے۔ میں آذر پر کھپو و مائز کیوں کروں جبکہ میں لیتق کو چن سکتی ہوں۔

تمہیں پتا ہے نور! میں بہت بار ڈیل مائنڈڈ ہوئی ہوں دل اور ضمیر آذر کے طرف جھکتے تھے لیکن دماغ۔ دماغ نے ہر بار لیتق کو چنا پھر میں ایک روز اس کے ساتھ مارکیٹ گئی لیتق نے کہا میں اس کی طرف سے کوئی تحفہ لے لوں۔ میں نے شرارت میں اسے وہ برسلٹ خرید کر دینے کے لیے کہہ دیا جس کے لیے ایک مرتبہ آذر مجھے انکار کر چکا تھا کیونکہ وہ بہت مہنگا تھا لیکن تمہیں پتا ہے نور! کیا ہوا؟ لیتق نے بنا کسی اعتراض کے وہ برسلٹ مجھے خرید دیا۔ بس اسی وقت میں مطمئن ہو گئی اور میں نے لیتق کے حق میں فیصلہ کر لیا۔ وہی میرے لیے بہترین تھا کیونکہ اس کی دولت دن بدن بڑھ رہی تھی گھٹ نہیں رہی تھی آذر کی طرح۔“

مجھے بے اختیار حسن یاد آیا۔

”تم دراصل ریک میں رکھی گڑیا ہو نور! جس کی چمک ہر سال کم ہو رہی ہے جبکہ عفیوہ کی چمک تم سے چالیس نہیں پچاس گنا زیادہ ہے۔“

”دولت کی اہمیت اور چمک و جاہت کے مقابلے میں ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے۔“ مجھے خاموش پا کر نمل نے دوبارہ کہا۔

”لیکن محبت سے زیادہ تو نہیں ہوتی پھر دولت ایک ”چیز“ ہے انسان ایک ”وجود“ زندہ سانس لیتا۔ چیز اور انسان میں فرق ہوتا ہے نمل! میں نے وہی کہا جو حسن سے کہہ چکی تھی۔

”لفظوں کو جیسے بھی توڑ مروڑ لو بات تو ایک ہی ہے۔“ اس نے بھی وہی جواب دیا جو حسن نے دیا تھا۔ ”تمہیں نہیں لگتا تمہارے بغیر آذر کی زندگی بہت